اُمّتِ مسلمہ کا نصبُ العین

(کتاب و سنّت کی روشنی میں)

سیّد احمد عروج قادری

بسم الله الرحمن الرحيم

إِنَّ هَٰذِهِۦٓ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَٰحِدَةً وَأَنَا۠ رَبُّكُمْ فَٱعْبُدُونِ

الأنبياء ٩٣

فہرست مضامین

پیش لفظ	۵
تاریخ کا ایک مطالعہ	۷
کتاب اللہ کی آیات سے استدلال	۱۷
غلبہ اور اقتدار کس لیے؟	۲۸
اقامتِ دین، احادیث میں	۴۵
اقامتِ دین اقامت قرآن کا نام ہے	۶۰
امّت مسلمہ کا نصب العین	۹۸
ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی صورت	۱۷۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

جماعتِ اسلامی کا نصب العین "اقامت دین" ہے۔ اس جماعت نے یہ نصب العین اپنے جی سے وضع نہیں کیا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد یہی رہا ہے اور اب قیامت تک امتِ مسلمہ کا نصب العین بھی یہی ہے۔ یہ ایک فریضہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں پر عائد کیا ہے۔ کتاب اللہ، سنّت رسول اللہ اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے۔ شدّت سے ضرورت محسوس کی جا رہی تھی کہ امتِ مسلمہ کے نصب العین — اقامت دین — پر کتاب و سنت میں جو دلائل پھیلے ہوئے ہیں انھیں یک جا کیا جائے۔ اس طرح کی ایک کتاب مرتب کرنے میں دو فائدے پیش نظر ہیں۔ ایک یہ کہ جو لوگ جماعت اسلامی سے وابستہ ہیں انہیں ایک ہی جگہ تشفی بخش اور مفصّل دلائل مل جائیں اور دوسرا یہ کہ جو لوگ اس نصب العین کے صحیح ہونے پر مطمئن ہونا چاہیں انہیں آسانی کے ساتھ اس کی دلیلوں پر غور کرنے کا موقع مل سکے۔ یہ کتاب اسی احساس ضرورت کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب میں موضوع سے متعلق قرآن وحدیث کے تمام دلائل و براہین کا استقصار نہیں کیا گیا ہے۔ اگر ایسا کیا جاتا تو کتاب ضخیم ہوجاتی لیکن جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ کھلے ذہن سے پڑھنے والوں کے لیے اِنشاءاللہ کافی ہوگا۔

پورا مقالہ ماہنامہ زندگی کے "اشارات" میں بالاقساط چھپا تھا اور اب عنوانات کی تکمیل کرکے اس کو کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو اشاعتِ حق کا ذریعہ بنائے اور اپنے ایک حقیر بندے کی اس دینی خدمت کو قبول فرمائے۔ آمین۔

سیّد احمد عروج قادری

دفتر ماہنامہ زندگی۔ رامپور یو۔پی

تاریخ کا ایک مطالعہ

دنیا میں زندگی بسر کرنے کے بہت سے طریقے اور بہت سے نظام رائج ہیں۔ آپ ان طریقوں اور نظاموں کا مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ ان میں کے ہر طریقۂ حیات اور ہر نظامِ زندگی کا سلسلہ آگے بڑھ کر کسی ایک فرد پر ختم ہوتا ہے۔ کسی معاشرے کے صرف ایک فرد نے اس کی ابتدا کی، اور اسے پھیلانے میں اپنی پوری زندگی لگادی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک فرد کے نظریۂ زندگی کے سانچے میں ہزاروں لاکھوں افراد کی زندگیاں ڈھل گئیں اور پورا ایک نظام اُٹھ کھڑا ہوا۔ تاریخ کے اس مطالعے سے دو باتیں اوّل نظر میں معلوم ہوجاتی ہیں۔ پہلی یہ کہ ایک فرد ہزاروں افراد کو متاثر کرسکتا ہے اور اس کی تنہا ذات میں ایک پورا کاروانِ حیات پوشیدہ ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ انسان کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ غور و فکر کے بعد جس نظریۂ حیات کو وہ انسانیت کے لیے مفید سمجھتا ہے اس کو پھیلانا چاہتا ہے اپنی راہ کی ہر رکاوٹ دور کرنے کے لیے جان لڑا دیتا ہے اور اپنے نظریۂ زندگی کو کامیاب کرنے کے لیے کسی قربانی سے نہیں ہچکچاتا۔ اس کی یہ خواہش و کوشش تقاضائے عقل کے عین مطابق ہے۔ یہ بحث بالکل الگ ہے کہ اس نے جس نقطۂ نظر کو انسانیت کے لیے مفید سمجھا وہ فی الواقع مفید تھا یا مُضر، کامل تھا یا ناقص۔

زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ اور انفرادی و اجتماعی زندگی کو درست کرنے کا ایک نظام وہ بھی ہے جس کو ہم اسلام کہتے ہیں۔ اب اگر کوئی فرد یا کوئی جماعت اس نظام کے مفید انسانیت ہونے پر یقین کا دعویٰ کرتی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اسے پھیلانے اور کامیاب کرنے کے لیے جد و جہد نہ کرے۔

اس نظام کو دوسرے نظاموں پر پانچ واضح امتیازات حاصل ہیں۔

نظامِ اسلامی کے امتیازات

۱۔ اس نظام کا خالق انسان نہیں، بلکہ اللہ ہے اسی نے اس کو انسانیت کی فلاح کے لیے نازل فرمایا ہے۔

۲۔ یہ دنیا و آخرت دونوں ہی کی فلاح و کامیابی کا ضامن ہے۔

۳۔ تاریخ کا طویل تجربہ اور عقل کا مدلل فیصلہ بتاتا ہے کہ یہ نظام انسانیت کے لیے ہمیشہ مفید ہی ثابت ہوا ہے اور اس میں نقصان کا کوئی شائبہ نہیں۔

۴۔ یہ انسان کے تمام داعیات جذبات اور ضروریات کا تسلّی بخش جواب ہے۔

۵۔ یہ نظام اللہ نے جن افراد پر نازل کیا انھوں نے اسے پھیلانے اور برپا کرنے کی کوشش محض عقلی و جذباتی تقاضے کی بنا پر نہیں، بلکہ اس کام پر اللہ کی طرف سے مامور ہو کر کی ہے۔ تاریخ کے یہی افراد انبیاء کرام علیہم السلام تھے جن کا سلسلہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکا ہے۔

اقامتِ دین کا مفہوم

"اقامتِ دین" میں دین سے مراد وہ دین حق ہے جسے اللہ رب العالمین اپنے تمام انبیاء کے

ذریعہ مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں بھیجتا رہا ہے اور جسے آخری اور مکمل صورت میں تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نازل فرمایا اور جو اب دنیا میں ایک ہی مستند، محفوظ اور عند اللہ مقبول دین ہے اور جس کا نام اسلام ہے۔

یہ دین انسان کے ظاہر و باطن اور اس کے زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی گوشوں کو محیط ہے، عقائد، عبادات اور اخلاق سے لے کر معیشت، معاشرت اور سیاست تک انسانی زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس کے دائرے سے خارج ہو۔

یہ دین جس طرح رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا ضامن ہے اسی طرح دنیوی مسائل کے موزوں حل کے لیے بہترین نظام زندگی بھی ہے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی صالح اور ترقی پذیر تعمیر صرف اسی کے قیام سے ممکن ہے۔

اس دین کی "اقامت" کا مطلب یہ ہے کہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر اس پورے دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے اور ہر طرف سے یکسو ہو کر کی جائے اور انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام گوشوں میں اسے اس طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ فرد کا ارتقاء معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اسی دین کے مطابق ہو۔

لفظ اقامت کے چند استعمالات

اقامت کے لغوی معنی کھڑا کرنے اور سیدھا کرنے کے ہیں۔ اسی معنی کی مناسبت سے اس لفظ کے متعدد اصطلاحی و شرعی معنی بھی کلام عرب اور قرآن و حدیث میں مستعمل ہیں۔ مثال کے طور پر کسی بیٹھے ہوئے انسان کے لیے یہ لفظ استعمال کیا جائے گا تو اس کے

معنیٰ وہی ہوں گے جو اصل لغت میں اس کے معنے ہیں۔ یعنی کھڑا کرنا جیسے کہا جائے کہ
کان زیدٌ قاعداً فاقامہٗ خالدٌ (زید بیٹھا ہوا تھا تو خالد نے اس کو کھڑا کر دیا)
کسی ٹیڑھی لکڑی کے لیے استعمال ہوگا تو اس کے معنے سیدھا کرنے کے ہوں گے۔ مثلاً
اَقَامَ الْعُوْدَ (اس نے لکڑی سیدھی کر دی)

معنوی چیزوں کے لیے جب یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے متعدد اصطلاحی
و شرعی معنے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً نماز کے لیے یہ لفظ بولا جائے گا تو اقامتِ صلوٰۃ کے
معنے اس کو پورے حدود و شروط کے ساتھ ادا کرنے کے ہوں گے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ۔
نماز قائم کرو۔ یعنی اس کو ان حدود و شروط کے ساتھ ادا کرو جن کی تعلیم شریعت نے دی ہے۔

یہ لفظ کسی حدِ شرعی کے لیے مستعمل ہوگا تو اس کے معنے نافذ کرنے کے ہوں گے۔
مثلاً اَقَامَ حَدَّ السَّرِقَۃِ (اس نے چوری کی حد نافذ کی) کسی آئین و قانون کے لیے
استعمال ہوگا تو اس کے معنے اس کو نافذ اور رائج کرنے کے ہوں گے۔ مثلاً اَقَامَ
الْقَوَانِیْنَ الْاِسْلَامِیَّۃَ (اس نے اسلامی قوانین نافذ اور رائج کیے) ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے:۔

لَحَدٌّ یُّقَامُ فِی الْاَرْضِ خَیْرٌ	کوئی ایک حد بھی جو زمین میں نافذ
لِّاَھْلِھَا مِنْ اَنْ یُّمْطَرُوْا	کی جاتی ہے وہ اہل زمین کے لیے چالیس
اَرْبَعِیْنَ صَبَاحًا۔	دن کی بارش سے زیادہ بہتر ہے۔

اس حدیث میں اقامت کے معنیٰ نافذ کرنے کے ہیں۔ کسی حدِ شرعی کو نافذ کرنے
کے معنیٰ یہی ہوتے ہیں کہ اس پر ٹھیک اس طرح عمل کیا جائے جس کی تعلیم دی گئی ہے
مثلاً چوری کی حد نافذ کرنے کے معنے یہ ہیں کہ قاضی کے فیصلے کے بعد حکومت اسلامی کا
کوئی کارندہ تعلیم نبوی کے مطابق چور کا ہاتھ کاٹ دے۔

دین اسلام چونکہ انفرادی و اجتماعی احکام کا مجموعہ ہے اس لیے کسی حکم مثلاً نماز کے لحاظ سے اس کے معنیٰ اس کو اچھی طرح ادا کرنے کے ہوں گے اور کسی دوسرے حکم مثلاً حدِّ زنا کے اعتبار سے اس کے معنی نافذ کرنے کے ہوں گے۔ یہ بات بھی ناقابلِ انکار ہے کہ دینِ اسلام ایک مکمل قانونِ حیات اور آئینِ زندگی ہے اس لیے اقامتِ دین کے مفہوم میں دین کو نافذ اور رائج کرنا بھی داخل ہے۔ اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ اقامتِ دین کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام کے قانونِ حیات اور آئین زندگی کو دنیا میں نافذ اور رائج کیا جائے تو اس کی یہ بات بالکل صحیح ہے۔

مختلف تعبیرات کا مسئلہ

یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان میں کسی ایک حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے متعدد اور مختلف تعبیریں اختیار کی جاتی ہیں۔ یہ فی الواقع کسی زبان کی بلاغت کا مسئلہ ہے۔ وہ زبان بلیغ اور ترقی یافتہ نہیں سمجھی جاسکتی جس میں کسی حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے بس ایک ہی طرزِ تعبیر اور یکساں قسم کے لگے بندھے الفاظ کے سوا کچھ نہ ہو۔ یہ بات بھی اہلِ علم و اہلِ زبان کے درمیان معروف ہے کہ متعدد اشیاء کے کسی مجموعے کو ظاہر کرنے یا اس کی نشاندہی کے لیے کبھی اس کے کسی نمایاں اور اہم جزو کا نام لیا جاتا ہے لیکن اس سے مقصود پورا مجموعہ ہوتا ہے۔ عربی زبان دنیا کی بلیغ ترین زبان ہے اور اس کے بہترین نمونے ہمیں قرآن و حدیث میں ملتے ہیں۔ جو لوگ زبان کی بلاغت اور اہلِ علم کے درمیان اس معروف حقیقت سے ناواقف ہیں وہ سخت دھوکا کھاتے ہیں۔ دیکھیے، لوگوں کے درمیان یہ حدیث مشہور ہے مَنْ قَالَ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ (جس نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوگا۔)

اب اگر اس سے کوئی شخص یہ نتیجہ اخذ کرے کہ صرف زبان سے یہ کلمہ کہہ لینا کافی ہے دل میں یقین ہو یا نہ ہو تو ایسا شخص قرآن وحدیث سے نرا جاہل سمجھا جائے گا، یا اس حدیث سے کوئی شخص یہ نتیجہ نکالے کہ رسالت کا اقرار ضروری نہیں ہے صرف توحید کا اقرار کافی ہے تو اسے بھی حدیث کی زبان سے ناواقف سمجھا جائے گا۔

"دین" احکام وقوانین کا مجموعہ اور ایک جامع اصطلاح ہے اس کو ظاہر کرنے کے لیے متعدد و مختلف تعبیریں اور اسلوب بیان اختیار کیے گئے ہیں۔ کہیں شہادت، شاہد اور شہداء علی الناس کے الفاظ سے اس کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ کہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے الفاظ بول کر اس مجموعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ کہیں بندگیِ رب اور اطاعت رسول کا حکم دے کر پورے دین کی پیروی کا مطالبہ کیا گیا ہے کہیں اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ سے اس کی تعبیر کی گئی ہے اور متعدد مقامات پر تو صرف اقرارِ ربوبیت کو پورے دین کا قائم مقام قرار دیا گیا ہے قرآن و حدیث کی ان تعبیرات اور استعمالات سے ناواقفیت کی بنا پر لوگ نہ صرف قرآن فہمی کی نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں بلکہ ان کا تصور دین ہی ناقص ہو جاتا ہے اس موقع پر صرف آخری طرزِ تعبیر کو واضح کرنے کے لیے ایک آیت پیش کرتا ہوں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ	جن لوگوں نے کہا، ہمارا رب اللہ ہے
ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ	پھر وہ اس پر جمے رہے تو ان پر فرشتے
عَلَیْھِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا	یہ پیغام لے کر نازل ہوں گے کہ خوف
وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ	نہ کرو، غمگین نہ ہو اور اس جنت کی بشارت
الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ○	سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔

(حٰمٓ السجدہ۔ ۳۰)

اس آیت میں اقرارِ ربوبیت اور استقامت، پورے دین کو قبول کرنے اور زندگی کے آخری لمحے تک اس کے احکام پر عمل پیرا رہنے کی ایک تعبیر ہے۔

ایمان باللہ (جو دین کا اوّلین واہم ترین جزو ہے) کا ذکر پورے مجموع کی طرف نشاندہی کے لیے کیا گیا ہے۔ اگر اس تعبیر سے کوئی شخص واقف نہ ہو تو وہ سخت دھوکا کھا سکتا ہے، ٹھیک یہی اسلوب ایک حدیث میں بھی اختیار کیا گیا ہے۔ ایک صحابیؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا: "آپ مجھے ایک ایسی جامع بات بتا دیجیے کہ آپ کے بعد پھر کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔" آپ نے فرمایا:

قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ۔ (مسلم شریف)

تم کہو کہ میں اللہ پر ایمان لایا پھر اس پر جم جاؤ۔

اس حدیث میں بھی ایمان باللہ پورے دین کو ظاہر کرنے کی ایک تعبیر ہے تعلیم یہ دی گئی ہے کہ دین کی مکمل پیروی اور اس پر استقامت کو اپنا مقصدِ حیات بنا لو۔ یہی وہ چیز ہے جس کے بعد اپنی فلاح و نجات کے لیے کسی سے پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔

غلبۂ دین کی مختلف تعبیریں

قرآن وحدیث میں جس طرح دین حق کو مختلف انداز اور متعدد تعبیروں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اسی طرح غلبۂ حق کی حقیقت واضح کرنے کے لیے بھی متعدد تعبیریں اختیار کی گئی ہیں۔ دین کا اظہار، کلمۃ اللہ کا اعلاء، باطل پرستوں کی ہزیمت، حق پرستوں کی فتح، کافروں کی ہلاکت، مومنوں کی نجات۔ یہ تمام تعبیرات یہ حقیقت واضح کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرامؑ کو دین حق دے کر اس لیے نہیں بھیجا تھا کہ

صرف اس کا پیغام پہنچا دیا جائے، بلکہ اس لیے بھیجا تھا کہ وہ دین باطل پر غالب آئے۔

اقامتِ دین کا مثالی نمونہ

اس دین کی اقامت کا مثالی اور بہترین نمونہ وہ ہے جسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے قائم فرمایا:-

اس مثالی نمونے کے لیے خلافت راشدہ، خلافت علی منہاج النبوۃ، حکومت الٰہی اور اسلامی حکومت کی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں —— نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین نے جو حکومت قائم کی تھی اس میں بغیر کسی تفریق وتقسیم کے پورے دین اسلام کی مخلصانہ پیروی کی جاتی تھی اور انفرادی و اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں میں اسے اس طرح جاری ونافذ کر دیا گیا تھا کہ فرد کا ارتقاء معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل ٹھیک ٹھیک اسی دین کے مطابق تھی۔ اس مملکت میں جا کر ہر شخص اپنی کھلی آنکھوں سے یہ دیکھ سکتا تھا کہ اسلامی حکومت اور قرآنی معاشرہ کیسا ہوتا ہے اور "اقامت دین" کا مفہوم کیا ہے۔ جس طرح ایک کھڑے ہوئے شخص کے قدو قامت، جسمانی ساخت رنگ روپ اور چہرے مہرے کو پہچاننے کے لیے دیکھنے والی دو آنکھیں کافی ہیں۔ اسی طرح اقامت دین کا صحیح مفہوم جاننے کے لیے صدیق و فاروق کی خلافت کا مثالی نمونہ کافی ہے جس کی بلند قامتی اور اس کے تمام رنگ روپ تاریخ کے صفحات نے محفوظ کر لیے ہیں۔ یہ مثالی نمونہ صرف نمونہ ہی نہیں ہے بلکہ فریضۂ اقامت دین کی ایک روشن دلیل بھی ہے۔

انحطاط کا اثر

صدیوں کے انحطاط و زوال کا اثر یہ ہے کہ آج پڑھے لکھے

مسلمان بھی عام طور سے امت مسلمہ کے مقصدِ وجود، مقصدِ حیات، نصب العین اور جدوجہد کے مرکز و محور سے ناواقف ہو گئے ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ اس کا مقصدِ وجود اور نصب العین کیا ہے اور کس چیز کو اس کی جدوجہد کا مرکز و محور ہونا چاہیے۔ اس ناواقفیت کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دماغوں میں دین کا ایک بہت ہی محدود مفہوم اور انبیاء کرام علیہم السلام کے مقصد بعثت کا ایک مختصر جزو کُل دین بنا کر اتار دیا گیا ہے۔ وہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، مجالسِ وعظ نصیحت اور خوش اخلاقی و نیک چلنی کی ٹھنڈی تبلیغ ہی کو پورا دین سمجھتے ہیں اور اس سے آگے کچھ سوچنے کو تیار نہیں ہوتے بلکہ اب ان میں ایسے لوگ بھی پیدا ہو رہے ہیں جن کو اس بات کی کوئی شرعی دلیل ہی نہیں ملتی کہ انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصد اقامتِ دین تھا اور نہ انھیں اس بات کی کوئی دلیل ملتی ہے کہ اقامتِ دین کا مفہوم وہ ہے جس کی تشریح اوپر کی گئی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا فضل ہے کہ اس نے اپنی آخری کتاب، آخری نبی کی سیرت اور ان کے ساتھیوں کی تاریخ محفوظ کر دی ہے اور اس کا بھی انتظام فرما دیا ہے کہ قیامت تک ایک جماعت دینِ حق پر قائم رہ کر اس کی تقویت و اشاعت اور تجدید و اقامت کا فریضہ انجام دیتی رہے گی اس لیے اگر کوئی شخص یا کوئی گروہ تعصبات سے ہٹ کر کھلے ذہن کے ساتھ کتاب و سنّت اور تاریخ و سیرت کا مطالعہ کرے تو حق اس پر واضح ہو جائے گا۔

رسولوں کی بعثت کا مقصد کیا تھا؟ اس سلسلے میں سب سے بنیادی سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں

اپنے رسول کس مقصد سے بھیجے تھے۔ آیا غرض صرف اتنی تھی کہ گمراہ انسانوں تک دین حق کا پیغام پہنچا دیا جائے، وہ اسے قبول کر لیں تو بہت اچھا اور نہ قبول کریں تو بس انھیں عذابِ آخرت کی وعید سنا دی جائے۔ باقی رہی یہ دنیا تو یہاں ان سے نہ کش مکش کی ضرورت، نہ جنگ کی حاجت، نہ باطل کی شکست مقصود، نہ باطل پرستوں کی ہلاکت منظور۔ یا

رسولوں کو بھیجنے کی غایت یہ تھی کہ گمراہ انسانوں سے دین حق کو قبول کرنے کا مطالبہ کیا جائے اور اگر وہ اسے قبول نہ کریں، اپنی بغاوت و سرکشی پر جمے رہیں تو انھیں شکست دے کر یا ہلاک کر کے دین حق کو سر بلند اور دین باطل کو نگوں سار کر دیا جائے ـــــ ہمارے نزدیک اس بنیادی سوال کی دوسری شق ہی صحیح ہے۔ ہم پوری بصیرت کے ساتھ یہ یقین رکھتے ہیں کہ انبیاء کرام کے مبعوث کرنے کا ہرگز یہ مقصد نہ تھا کہ وہ خود مشرکانہ نظام کے تحت زندگی بسر کرتے رہیں یا اس نظام کے تحت زندگی گزارنے والی ایک ایسی جماعت تیار کر دیں جو بتوں کے بجائے صرف خدا کو سجدے کرنے کا حق رکھتی ہو، بلکہ اللہ انھیں اس لیے بھیجتا رہا ہے کہ دین شرک مغلوب اور دین توحید غالب ہو، ایک ایسی آزاد فضا اور ایک ایسا پاکیزہ ماحول مہیّا ہو جس میں دین حق کی مکمّل پیروی کی جا سکے اور اس پیروی میں کوئی طاقت مزاحم نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے کفر و شرک کی طاقت کے مقابلے میں اپنے رسولوں کو جب بھی بھیجا ہے اپنی مدد کا وعدہ کر کے بھیجا ہے اور کش مکش حق و باطل کے ہر نازک موڑ پر تسلّی دے کر ان کے حوصلوں کو برقرار رکھا ہے۔

کتاب اللہ کی آیات سے استدلال

چار قسم کی آیات

ہمارے اس دعوے پر پورا قرآن گواہ ہے۔ لیکن تمام آیتوں کا استقصاء ایک طویل کام ہے اس لیے ہم اختصار کے ساتھ چار قسم کی آیات سے چند دلائل یہاں پیش کریں گے۔

۱۔ وہ آیتیں جن میں عمومی طور پر تمام رسولوں سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ ہم تمھیں کفّار پر غالب کریں گے۔

۲۔ وہ آیتیں جن میں مخصوص طور سے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السّلام سے وعدہ کیا گیا ہے۔

۳۔ وہ آیتیں جن میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

۴۔ وہ آیتیں جن میں امتِ مسلمہ سے اس کا وعدہ کیا گیا ہے۔

پہلی دلیل

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝ (الصّٰفّٰت: ۱۷۱-۱۷۳)

اور اپنے بندوں یعنی رسولوں کے حق میں ہمارا فیصلہ پہلے ہی صادر ہو چکا ہے۔ بلاشبہ وہی وہ لوگ ہیں جن کی مدد کی جائے گی اور بلاشبہہ ہمارا ہی لشکر غالب رہے گا۔

یہ آیتیں کئی حقیقتوں کی واضح نشاندہی کر رہی ہیں۔

۱۔ تمام رسولوں سے یہ اللہ تعالیٰ کا غیر متبدل وعدہ اور اس کا یہ اٹل

فیصلہ ہے کہ وہ باطل پرست طاقتوں کے مقابلے میں ان کی مدد کرے گا۔

ب۔ رسولوں اور ان پر ایمان لانے والے داعیان حق کی حیثیت ایسے واعظوں کی نہیں ہوتی جن کا کام وعظ کہنے پر ختم ہو جاتا ہے بلکہ ان کی حیثیت فرمانروائے کائنات کے لشکر کی ہوتی ہے جو اس کے باغیوں کے خلاف صف آرا ہوتا ہے۔

ج۔ رسول جس دین اور جس پیغام کی تبلیغ پر مامور ہوتے ہیں اس کی حیثیت کسی ایسی تبلیغ، تبشیر سفارش اور نصیحت کی نہیں ہوتی جسے رد کر دینے کے بعد اس کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے بلکہ ایک ایسے فرمان شاہی کی ہوتی ہے جس کے انکار کو بادشاہ اپنے خلاف بغاوت اور چیلنج سمجھتا ہے۔

د۔ باغی لشکر کے مقابلے میں آخر کار بادشاہ کی وفادار فوج ہی غالب، کامیاب اور فاتح ہوتی ہے۔

دوسری دلیل

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ٥ (المجادلہ: ۲۱)	اللہ نے یہ بات لکھ دی ہے کہ یقیناً میں اور میرے رسول ہی غالب ہو کر رہیں گے۔ بلاشبہ اللہ قوی اور زبردست ہے۔

اس آیت میں بھی تمام رسولوں سے وعدہ کیا گیا ہے کہ وہ غالب ہوں گے بلکہ اس میں صراحت کے ساتھ اللہ نے اپنے آپ کو بھی باطل پرستوں کے مقابلے میں ایک فریق کی حیثیت سے ظاہر فرمایا ہے۔ یہ رسولوں اور ان کے

ماننے والوں کے لیے اتنی بڑی بشارت ہے جو ان کے حوصلوں کو ناقابلِ شکست بنا دیتی ہے۔

تیسری دلیل

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِرُسُلِهِمْ لَنُخْرِجَنَّكُمْ مِّنْ اَرْضِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ مِلَّتِنَا ؕ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ رَبُّهُمْ لَنُهْلِكَنَّ الظّٰلِمِيْنَ وَلَنُسْكِنَنَّكُمُ الْاَرْضَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِيْ وَخَافَ وَعِيْدِ ۝

اور آخر کار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے یا یہ کہ تم ہماری ملّت میں پلٹ آؤ تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے اور یہ (وعدہ) اس کے لیے ہے جو میرے حضور میں (جوابدہی کے لیے) کھڑے ہونے اور میری وعید سے ڈرے۔

(ابراہیم: ۱۴-۱۳)

یہ آیتیں بتاتی ہیں کہ خدا کے باغی جب اپنے وقت کے رسولوں کو جلا وطن کرنے کی دھمکی دیتے تھے تو اس نازک وقت میں خدا اپنے وعدے کی تجدید فرماتا اور اپنے رسولوں سے کہتا کہ گھبراؤ نہیں، عنقریب یہ دھمکی دینے والے اپنے ملک سے خود مٹ جائیں گے اور اپنی زمین میں ہم تمہیں آباد کریں گے اور تمہیں اس کے وارث ہوگے۔ آیت کا آخری ٹکڑا بتاتا ہے کہ خدا کی نصرت و حمایت اور وراثت زمین بنانے کا یہ وعدہ ہر اس گروہ کے لیے ہے جو آخرت کی

باز پرس اور عذاب الٰہی سے ڈرتا ہو اور اس طرح زندگی بسر کرے جس طرح اللہ کے رسولوں نے اپنی زندگیاں بسر کیں۔

چوتھی دلیل

جب فراعین مصر کی بغاوت و سرکشی اور بنی اسرائیل کا ظلم حد سے تجاوز کر گیا تو ارادۂ الٰہی میں جنبش پیدا ہوئی وہ ارادہ کیا تھا اسے خود فرمانروائے کائنات کے الفاظ میں دیکھیے۔

إِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِي الْأَرْضِ وَجَعَلَ أَهْلَهَا شِيَعًا يَسْتَضْعِفُ طَائِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ أَبْنَاءَهُمْ وَيَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ ۚ إِنَّهُ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِينَ ۝ وَنُرِيدُ أَن نَّمُنَّ عَلَى الَّذِينَ اسْتُضْعِفُوا فِي الْأَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ أَئِمَّةً وَنَجْعَلَهُمُ الْوَارِثِينَ ۝ وَنُمَكِّنَ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَنُرِيَ فِرْعَوْنَ وَهَامَانَ وَجُنُودَهُمَا مِنْهُم مَّا كَانُوا يَحْذَرُونَ ۝

(القصص: ۴-٦)

فرعون ملک مصر میں بہت بڑھ چڑھ رہا تھا اور اس نے وہاں لوگوں کے الگ الگ گروہ قرار دیے تھے۔ ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو اس نے اس قدر کمزور سمجھ رکھا تھا کہ ان کے بیٹوں کو ذبح کرا دیتا اور ان کی عورتوں (بیٹیوں) کو زندہ رکھتا۔ بلاشبہ وہ فسادیوں میں سے ایک فسادی تھا اور ہم نے ارادہ کیا کہ جو لوگ اس ملک میں کمزور سمجھ لیے گئے تھے ان پر احسان کریں اور انہیں سردار و پیشوا بنائیں اور انہیں (سلطنت) کا وارث بنا دیں۔ اور زمین میں ان کے اقتدار کو جما دیں اور فرعون و ہامان اور ان کے

لشکروں کو. بنی اسرائیل کی طرف سے
جس بات کا خطرہ تھا وہ بنی اسرائیل
کے ہاتھ سے اُن کے سامنے لے آئیں۔

بنی اسرائیل پر احسان کرنا، انھیں امامت و پیشوائی کے منصب پر فائز کرنا، انھیں حکومت و سلطنت کا وارث بنانا، زمین میں ان کے اقتدار کو جما دینا، اور فرعون و ہامان اور ان کے لشکروں کو مغلوب کرنا ـــ یہ تھا وہ ارادہ جو سلطانِ کائنات نے کیا۔

اللہ کا یہ ارادہ کس طرح ظہور میں آیا اس کی مفصل روداد آگے کی آیتوں اور قرآن کی دوسری سورتوں میں بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السّلام کو رسالت و نبوت عطا کر کے انھیں اس مشن کی تکمیل پر مامور فرمایا گیا اور انھیں کے ہاتھوں ارادۂ الٰہی ظہور میں آیا۔

ایک طرف فرعون کی جبّاریت زور آور حکومت تھی اور دوسری طرف مغلوب بنی اسرائیل کی انتہائی بے بسی اور کمزوری تھی۔ ایسی قوم کے دو بے بس افراد کا اس عظیم و جاں گداز مشن پر بھیجا جانا سخت حیرتناک، بلکہ دہشت ناک واقعہ تھا شاید اسی لیے مالک الملک نے اس مشن پر بھیجتے وقت ہی ان دونوں سے جو صریح وعدہ فرمایا اُس کے الفاظ بھی پڑھتے چلیے۔

قَالَ سَنَشُدُّ عَضُدَكَ بِاَخِيْكَ وَنَجْعَلُ لَكُمَا سُلْطَانًا فَلَا يَصِلُوْنَ اِلَيْكُمَا بِاٰيٰتِنَا	فرمایا ہم تمھارے بھائی کو تمھارا قوت بازو بنائیں گے اور تم دونوں کو ایسا غلبہ دیں گے کہ فرعون کے لوگ تم تک پہنچ بھی نہ سکیں گے

اَنۡتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الۡغٰلِبُوۡنَ ٥ (القصص: ۳۵)
ہماری نشانیوں کے زور سے تم دونوں اور تمھاری پیروی کرنے والے ہی غالب رہیں گے۔

قرآن کی ان صراحتوں کو پڑھ کر کون یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت موسیٰ و ہارونؑ باطل کو مغلوب کر کے حق کو غالب کرنے کے مشن پر مامور نہ تھے اور کون یہ تصوّر کر سکتا ہے کہ رسالت و نبوت کے منصب سے حکومت و سلطنت کا تعلق محض ضمنی اور جزوی ہوتا ہے۔ ان آیتوں سے زیادہ واضح اور کس نص صریح کی ضرورت ہے جو یہ بتائے کہ انبیاء کرامؑ کے مقصد بعثت میں غلبۂ حق اور حکومت و اقتدار کا حصول بھی داخل رہا ہے۔ کیونکہ حکومت کے بغیر دین حق کی کامل پیروی ممکن ہی نہیں ہے۔

پانچویں دلیل

مکّے میں دعوت اسلامی کے ابتدائی دور ہی میں یہ پُرجلال شاہی اعلان سنا دیا گیا تھا۔

سَيُهۡزَمُ الۡجَمۡعُ وَيُوَلُّوۡنَ الدُّبُرَ ٥ (القمر: ۴۵)
عنقریب ان کا جتھا شکست کھا جائے گا اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مکّے میں دعوت اسلامی کا رنگ کچھ اور تھا اور مدینہ پہنچ کر اس کا رنگ اچانک بالکل بدل گیا مکّے میں آخری نبیؐ نے اپنے آپ کو اور اپنے ماننے والوں کو بس ایک واعظ و ناصح گروہ کی شکل میں پیش کیا تھا اور مدینہ پہنچ کر انھوں نے یکایک تلوار سونت لی۔ معلوم نہیں یہ چھوٹی سی آیت ان کی

نگاہ سے گزری ہے یا نہیں۔ اس آیت نے ابتدا ہی میں مخاطبین قرآن پر یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ اسلام کی جو دعوت پیش کی جا رہی ہے اس کی نوعیت کیا ہے اور اس کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ نہ مسلمانوں کو اس کے بارے میں کوئی غلط فہمی تھی اور نہ کفار و مشرکین کو۔ مسلمان بھی خوب جانتے تھے کہ دین حق کو غالب کرنے کے لیے جہاد بالسیف کا مرحلہ آ کر رہے گا اور کفار بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ دعوت اسلامی ان کے تخت اقتدار کو الٹ دینے والی ہے۔

چھٹی دلیل

اَفَلَا یَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِی	کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ہم زمین کو اس کے
الْاَرْضَ نَنْقُصُھَا مِنْ اَطْرَافِھَاؕ	کناروں سے گھٹاتے چلے آ رہے ہیں۔
اَفَھُمُ الْغٰلِبُوْنَ ○	پھر کیا وہی غالب رہیں گے؟

(انبیاء: ۴۴)

اس آیت میں مشرکوں سے کہا گیا ہے کیا وہ دیکھتے نہیں کہ دین حق کا دائرہ پھیلتا جا رہا ہے اور دین باطل کا دائرہ سمٹتا جا رہا ہے کیا اس کے بعد بھی اُن کے دل کی آنکھیں نہیں کھلتیں۔ کیا وہ محسوس نہیں کرتے کہ دعوت حق کے پیچھے کونسی طاقت کام کر رہی ہے۔ کیا وہ اب بھی اسی خام خیالی میں پڑے ہیں کہ حق پرستوں کے مقابلے میں وہی غالب رہیں گے۔ کیا انہوں نے ہمارے رسولؐ کے ڈراوے کو ایک بے اثر اور بے نتیجہ دھمکی سمجھ رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس استفہام انکاری نے پوری قوت کے ساتھ اس بات کا اعلان کیا ہے کہ غالب، محمدؐ و اصحابِ محمدؐ ہی ہوں گے اور مغلوبیت

ان لوگوں کے حصے میں آئے گی جو آج حق کے سامنے سینے تان کر چل رہے ہیں۔

ساتویں دلیل

بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ ○

(انبیاء: ۱۸)

بات یہ ہے کہ ہم حق کو (پتھر کی طرح) باطل پر کھینچ مارتے ہیں تو وہ اس کا سر توڑ دیتا ہے۔ پھر وہ دیکھتے دیکھتے ملیا میٹ ہو جاتا ہے اور تمہارے لیے تباہی ہے ان باتوں کی وجہ سے جو تم بناتے ہو۔

اس آیت نے استعارے کی زبان میں اس حق کی نوعیت واضح کر دی جسے دے کر اللہ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کو مبعوث فرمایا تھا۔ کفار یہ سمجھتے تھے کہ یہ روئی کا پولا ہے جس کی مار سے ان کے دین کو کسی قسم کا کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اللہ نے فرمایا۔ یہ روئی کا پولا نہیں، بلکہ پتھر کا گولا ہے جو تمہارے دینِ باطل کا سر توڑ کر رکھ دے گا۔ تم بیہودہ اور لغو باتیں بنا کر خود اپنی تباہی کا سامان کر رہے ہو۔

آٹھویں دلیل

وَإِنْ كَادُوا لَيَسْتَفِزُّونَكَ مِنَ الْأَرْضِ لِيُخْرِجُوكَ مِنْهَا وَإِذًا لَا يَلْبَثُونَ خِلَافَكَ إِلَّا قَلِيلًا ○

(بنی اسرائیل: ۷۶)

اور یہ لوگ چاہتے تھے کہ تمہارے قدم اس سرزمین سے اکھاڑ دیں اور تمھیں یہاں سے نکال باہر کریں لیکن اگر ایسا کریں گے تو تمہارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھیر سکیں گے۔

ہم نے اوپر تیسری دلیل میں سورۂ ابراہیم کی دُو آیتیں نقل کر کے دکھایا ہے کہ جب منکرینِ حق اپنے وقت کے رسول کو جلا وطن کرنے کی دھمکی دیتے تھے تو ایسے نازک وقت میں اللہ تعالیٰ اپنی مدد کے وعدے کی تجدید فرماتا تھا۔ بنی اسرائیل کی اس آیت نے بتایا کہ جب کفّار نے حضورؐ کو مکّے سے نکالنے کا ارادہ کیا تو اللہ نے اپنی سنّت کے مطابق وعدے کی تجدید فرمائی۔ اس سے ایک طرف تو حضورؐ کی ڈھارس بندھی اور دوسری طرف کفّارِ مکہ کو بھی ہوشیار کیا گیا۔ لیکن اگلوں کی طرح انھوں نے بھی اس دھمکی کی پروا نہ کی اور حضور مکّے سے نکلنے پر مجبور ہوئے اور پھر دنیا نے دیکھ لیا کہ اللہ کا وعدہ اور وعید کس طرح ظہور میں آئے سورۂ انفال میں آپ کے خلاف کفّارِ مکّہ کے مکر کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے :-

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ۝ (الانفال: ۳۰)	وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جب کہ منکرینِ حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلا وطن کر دیں وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چالیں چل رہا تھا اور اللہ کی چال سب سے بڑھ کر ہوتی ہے۔

ایک لمبی داستان کو چند الفاظ میں سمیٹ لیا گیا ہے۔ اس کو تفصیل کے ساتھ یہاں نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آیت کا آخری ٹکڑا قابلِ غور ہے جو یہ بتاتا ہے کہ اللہ نے اپنے رسولوں سے امداد کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ اسے

کس طرح پورا کرتا رہا ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا گیا اس طرح کی تمام آیتیں پیش کرنا مقصود نہیں ہے کیونکہ یہ چند آیتیں بھی پوری وضاحت سے اعلان کر رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے رسولوں کو اس مقصد سے بھیجتا رہا ہے کہ ان کے ذریعے باطل کو شکست دے اور حق کو غالب کرے۔

اوپر کی آیتوں میں یہ بھی موجود ہے کہ جو وعدہ رسولوں سے کیا گیا ہے وہی ان پر ایمان لانے والوں سے بھی کیا گیا ہے لیکن مزید وضاحت کے لیے چند ایسی آیات بھی پیش کی جا رہی ہیں جن میں صراحت کے ساتھ ایمان لانے والوں کا ذکر ہے یا جن میں اصل مخاطب مومن گروہ ہی ہے۔

نویں دلیل

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝ (المومن: ۵۱)	بلا شبہ ہم اپنے رسولوں اور مومنوں کی مدد کرتے ہیں دنیا کی زندگی میں اور مدد کریں گے جس دن گواہ کھڑے ہوں گے۔ (یعنی قیامت کے دن)

دنیا کی زندگی میں رسولوں اور مومنوں سے جس مدد کا وعدہ کیا گیا ہے اس کا ذکر اوپر کی آیتوں میں گزر چکا اور اس مدد کی تفصیلات سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ حزب الشیطان کے مقابلے میں حزب اللہ کو کامیاب کرنا۔ یہ ہے ان تفصیلات کا خلاصہ اور اس مدد کی نوعیت کا بیان آگے کی آیتوں میں بھی آ رہا ہے۔

دسویں دلیل

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَ أَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ٥ (آل عمران: ۱۳۹)	دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو تمہیں سربلند رہوگے۔ اگر مومن ہو۔

اس آیت نے وعدۂ نصر کی نوعیت یہ بتائی کہ اللہ مومنوں (اگر وہ سچے ہوں) کو سربلند اور کافروں کو نگوں سار کرے گا۔

گیارھویں دلیل

وَمَنْ يَّتَوَلَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَاِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْغَالِبُوْنَ۔ (المائدۃ: ۵۶)	اور جو اللہ اس کے رسول اور مومنوں کی رفاقت اختیار کرے گا تو اسے معلوم ہو کہ اللہ ہی کی جماعت غالب ہونے والی ہے۔

اس آیت کا اسلوبِ بیان قابلِ غور ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی جماعت تو بنی ہی اس لیے ہے کہ وہ غالب ہو۔ آگے کی بات یہ ہے کہ جو لوگ اللہ رسول اور مومنوں کو اپنا دوست بنائیں اور ان کی رفاقت اختیار کریں، غلبہ انہیں بھی حاصل ہوگا۔

حق و باطل کی کش مکش میں جو لوگ باطل کے ظاہری زور و قوت کو دیکھ کر کفار و مشرکین سے دوستی کے پینگ بڑھاتے، یا یہود و نصاریٰ کی طرف مائل ہونے، یا نفاق و ارتداد کی روش اختیار کرتے ہیں وہ سخت احمق ہیں۔ اگر وہ غلبہ اور عزت و قوت چاہتے ہیں تو انہیں حزب اللہ کا ساتھ دینا چاہیے۔ کیونکہ حقیقی غلبہ و عزت اسی گروہ کے لیے مقدر ہے

غلبہ اور اقتدار کس لیے

اس سوال کا جواب باطل پرستوں کو مغلوب و نگوں سار کرنے اور حق پرستوں کو غالب و سربلند کرنے کی غرض کیا ہے اور کس لیے انہیں غلبہ اور اقتدار بخشا جاتا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے:۔

حق پرستوں کو غلبہ و اقتدار اس لیے بخشا جاتا ہے کہ خدا کا بھیجا ہوا دین خود ساختہ ادیان پر غالب اور اسی کا نازل کیا ہوا قانونِ حیات نافذ و رائج ہو۔

انبیاء کرام کے مقصدِ بعثت کی جو بحث اوپر گذری اس میں یہ سوال وجواب اشارۃً و اجمالاً موجود ہے۔ لیکن ہم چاہتے ہیں کہ یہاں صراحتہً و تفصیلاً بھی کچھ عرض کریں۔ اس لیے کہ اس کے بغیر مقصدِ بعثت کی بحث مکمل نہیں ہوسکتی۔ پہلے چند آیتیں پیش کی جارہی ہیں۔

دو آیتیں سورۃ بقرہ رکوع ۲۶ آیت ۲۱۳ اور ۲۱۴ سامنے رکھیے۔ ہم ان دو آیتوں کا صرف ترجمہ نقل کرتے ہیں۔

ابتداء میں تمام انسان ایک ہی دین وملّت پر تھے (پھر ان کے درمیان اختلاف پیدا ہوا) تب اللہ نے اپنے نبی بھیجے جو بشارت اور ڈراوا سنانے

والے تھے اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ حق کے بارے میں ان کے درمیان جو اختلافات پیدا ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے۔ اختلاف ان لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا انھوں نے روشن ہدایات پا لینے کے بعد محض اس لیے حق کو چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔

پس جو لوگ انبیاء پر ایمان لائے انہیں اللہ نے اپنے اذن سے اس حق کا راستہ دکھا دیا جس میں لوگوں نے اختلاف کیا تھا اللہ جسے چاہتا ہے راہ راست دکھا دیتا ہے۔ (۲۱۳)

پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس یونہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ ان پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے۔ یہاں تک کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہلِ ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔ اس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ کی مدد قریب ہے۔ (۲۱۴)

یہ دو آیتیں ہمارے سامنے صرف انبیاء علیہم السلام کے مقصدِ بعثت ہی کو واضح نہیں کرتیں بلکہ دینِ حق جس جاں کاہ و جاں گسل مرحلوں سے گزر کر قائم و غالب ہوتا ہے اس کا بھی نقشہ پیش کرتی ہیں۔ ان دو آیتوں سے مندرجہ ذیل چار باتیں بوضاحت معلوم ہوتی ہیں۔

الف۔ دنیا میں بنی نوعِ انسان نے اپنا سفرِ حیات حق کی روشنی میں شروع کیا تھا

حق کا علم پا لینے کی وجہ سے انسانی گروہ عرصۂ دراز تک ایک ہی ملّت اور ایک ہی امّت بنا رہا پھر ایسا ہوا کہ کچھ خودغرضوں کی نفسانیت، ایک دوسرے پر زیادتی اور ذاتی مفاد کے جھگڑوں نے وحدت ملّت کو پارہ پارہ کر دیا اور دینِ حق میں اختلافات پیدا کر دیے لیکن اللہ چونکہ رحمٰن و رحیم ہے اس لیے اس نے انسانوں کو تباہ و برباد ہونے کے لیے بے سہارا نہ چھوڑا بلکہ ان کی صلاح و فلاح کے لیے اپنے برگزیدہ بندے مبعوث کیے۔

ب۔ تمام انبیاء و رُسُل کے ساتھ اللہ کی طرف سے نازل کردہ کتاب برحق بھی ہوتی تھی جو عقائد و اعمال کے تمام اختلافات و نزاعات کے لیے قاضی اور حاکم کی حیثیت رکھتی تھی۔ انبیاء صرف اسی لیے نہیں بھیجے جاتے تھے کہ خوش خبری اور ڈراوا سنادیں بلکہ انہیں کتاب برحق دے کر اس بات پر بھی مامور کیا جاتا تھا کہ وہ تمام اختلافات کو مٹا کر لوگوں کو پھر اسی دینِ حق پر جمع کریں جس میں اختلاف پیدا کر کے وہ الگ الگ ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ زندگی کا کوئی معاملہ بھی ہو صرف اس کتاب کو یہ حق ہوتا تھا کہ وہ اس کے صحیح یا غلط، حق یا باطل ہونے کا فیصلہ کرے۔ اللہ کی کتابوں یعنی اس کے نازل کردہ قوانین و شرائع کی حاکمیت اور ان کی حیثیت کی مزید توضیح کے لیے سورۂ مائدہ کی آیت ۴۴ تا ۵۰ نیز آیات ۶۶ تا ۶۸ کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

ج۔ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لانے والوں کو مخاطب کر کے بتایا گیا ہے کہ اگلی امتوں نے اپنے وقت کے رسولوں اور خدا کی کتابوں کو اپنا قاضی و حاکم آسانی سے تسلیم نہیں کیا اور یہ راہ پھولوں کی سیج نہیں رہی ہے۔ یہ ہمیشہ کانٹوں سے بھری رہی ہے۔ تم سے پہلے کے داعیانِ حق نے اس راہ میں ہر طرح کی مصیبتیں جھیلی ہیں

اور دشمنانِ حق کے نرغے میں اس طرح ہلا مارے گئے ہیں کہ اہلِ ایمان کے ساتھ وقت کے رسول تک چیخ اٹھے ہیں۔ پھر تم کس بنا پر یہ توقع رکھ سکتے ہو کہ جو کچھ تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے۔ وہ تم پر نہیں گزرے گا۔

د۔ اللہ کے باغیوں سے کش مکش اور کتاب برحق کی اقامت و تنفیذ کی تمام سعی و جہد کا مقصود دخول جنت کا استحقاق ہے۔ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ کے ٹکڑے سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اقامت دین کی جدوجہد میں جان کھپانے والوں کا محرک عمل اور اصل مطمح نظر اللہ کی خوشنودی اور جنت کا حصول ہے اور دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جنّت کا حصول اقامت دین کے ساتھ وابستہ ہے۔ خدا کے نازل کردہ قانون پر لوگوں کو جمع کرنے کی جدوجہد سے دامن کشی کے باوجود رضائے الٰہی اور جنت کے حصول کی توقع صحیح نہیں ہے۔

تیسری آیت

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَیْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝

ہم نے اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان پر کتاب اور میزانِ عدل نازل کی تاکہ لوگ عدل و انصاف پر قائم ہو جائیں اور ہم نے لوہا اتارا اور اس میں سخت جنگ کا سامان ہے اور لوگوں کے لیے اس میں کچھ دوسرے فائدے ہیں اور اس لیے کہ اللہ جان لے کر بن دیکھے کون اس کی اور اس کے رسولوں کی

(الحدید: ۲۵) مدد کرتا ہے۔ بلاشبہ اللہ قوی اور
زبردست ہے۔

کتاب کے ساتھ میزان نازل کرنے کا ذکر سورۂ شوریٰ آیت ۱۷ میں بھی ہے
سورۂ حدید کی اس آیت کا اسلوب ایسا ہے جس نے نہ صرف انبیاءؑ کے مشن کو واضح
کردیا ہے، بلکہ خاص حالات میں اس مشن کو کامیاب کرنے کے آخری مرحلے اور عام
حالات میں اس کو قائم رکھنے کی ضروری تدبیر کی طرف بھی رہنمائی کی ہے۔
پہلے ٹکڑے میں اللہ رب العٰلمین نے فرمایا ہے کہ ہم اپنے رسولوں کو کتاب و
میزان کے ساتھ اس لیے بھیجتے رہے ہیں کہ ظالم انسان ظلم کی روش ترک کرکے عدل و
انصاف کی روش پر قائم ہوجائیں ظالموں کا عدل و انصاف کی روش پر قائم ہوجانا
اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ اقامت عدل کی سعی کی جائے اس لیے دوسرے ٹکڑے
میں جس حقیقت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ عدل و انصاف پر قائم ہونا
اور قائم رہنا کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ اس کے لیے انتہائی جدوجہد لازمی
اور آخری تدبیر کے طور پر قوت کا استعمال بھی ضروری ہے۔ لوہے کی تخلیق کے
تین اغراض بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے آلات حرب اور سامانِ جنگ تیار
کیے جاتے ہیں۔ دوسری یہ کہ آلاتِ حرب کے علاوہ اس میں کچھ دوسرے منافع
بھی ہیں اور تیسری یہ کہ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کو دیکھے بغیر کون لوگ
اس قوت کو اس کے دین اور اس کے رسولوں کی مدد میں صرف کرتے ہیں۔

عدل کے قیام و بقا کے لیے اقتدار ضروری ہے

اس آیت سے بھی بصراحت
معلوم ہوا کہ رسولوں کی

بعثت کا مقصد دنیا سے ظلم و جور کا استیصال اور عدل و انصاف کا قیام رہا ہے اور عدل و انصاف کو قائم کرنے اور قائم رکھنے کے لیے سلطان قائم بالسیف (اقتدار جو بزور طاقت ظلم کی بیخ کنی کرتا رہے) کا وجود ضروری ہے۔

کیا اقامت دین کا نصب العین اس کے سوا کوئی اور مفہوم رکھتا ہے؟ کیا اس آیت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اللہ کے دین کی مدد کر کے اس کو ادیان باطلہ پر غالب کرنا بعثت انبیاء کا مقصد تھا؟ اور دین حق کو غالب کرنے کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ اللہ کا بھیجا ہوا نظام عدل قائم ہو اور اس کے قوانین نافذ ہوں اور اس کی مکمل پیروی کی راہ میں کوئی مزاحم طاقت باقی نہ رہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ قرآن سمجھ کر پڑھنے کے باوجود کوئی مسلمان دین کے جامد اور محدود نقطۂ نظر پر کس طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔

اس آیت کے اخیر میں ان اللہ قوی عزیز فرما کر مجاہدین حق کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اللہ تمھاری مدد کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ اس نے تمہیں جہاد کا حکم دے کر اور اپنے دین کی امداد کا شرف عطا کر کے تم پر احسان کیا ہے اور تمھارے لیے مراتب عالیہ کا دروازہ کھولا ہے، ورنہ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ چنانچہ اس نے اپنی قدرت قاہرہ سے کتنی ہی سرکش قوموں کو ہلاک کر کے اپنے وفادار بندوں کو غلبہ عطا کیا ہے۔

مفسر ابن کثیر کی ایک عبارت

کتاب برحق کی تنفیذ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے ماننے والوں کے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے اس کی مزید توثیق و توضیح کے لیے میں نے گزشتہ قسط میں سورۂ مائدہ کے رکوع سات کی طرف متوجہ کیا تھا۔ جس میں کتاب الٰہی کے مطابق فیصلہ نہ کرنے

والوں کو کافر ظالم اور فاسق کہا گیا ہے۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے اس کے بعد وہ رکوع ذیل کی آیت پر ختم ہوا ہے :-

اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۝	کیا وہ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں اور
وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا	ان لوگوں کے لیے جو یقین رکھتے ہیں اللہ
لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ (مائدہ : ۵۰)	سے بہتر حکم کس کا ہے۔

اس آیت کے تحت مفسر ابن کثیرؒ نے یہ چونکا دینے والی عبارت لکھی ہے:

ینکر تعالیٰ علی من خرج	اللہ تعالیٰ اس آیت میں ان لوگوں پر
من حکم اللہ المحکم	انکار کر رہا ہے جو اللہ کے اس محکم فیصلہ
المشتمل علیٰ کل خیر الناھی	و قانون سے الگ ہو جائیں جو ہر خیر
عن کل شر وعدل الیٰ	پر مشتمل اور ہر شر سے روکنے والا ہے
ما سواہ من الآراء و	اور اس کے بدلے میں لوگوں کی ایسی
الاھواء والاصطلاحات	خواہشات آراء اور اصطلاحات اختیار
التی وضعھا الرجال	کرلیں جن کی اللہ کی شریعت میں کوئی
بلا مستند من شریعۃ	سند اور دلیل موجود نہ ہو جس طرح
اللہ کما کان اھل الجاھلیۃ	اہل جاہلیت اپنی خواہشات اور آراء
یحکمون بہ من الضلالات	سے گھڑی ہوئی گمراہیوں اور جہالتوں
والجھالات مما یضعونھا	کے مطابق زندگی کے معاملات کے فیصلے
بآرائھم واھوائھم	کیا کرتے تھے اور جس طرح تاتاری
وکما یحکم بہ التتار	ان ملکی سیاستوں کے مطابق فیصلے

من السیاسات
الملکیة الماخوذة عن
ملکهم جنکر خان الذی
وضع له الیاسق وهو
عبارة عن کتاب مجموع
من احکام قد اقتبسها
عن شرائع شتی من
الیهودیة والنصرانیة
والملة الاسلامیة وغیرها
وفیها کثیر من الاحکام
اخذها من مجرد نظره
وهواه فصارت فی بنیه
شرعا متبعا یقدمونها
علی الحکم بکتاب الله و
سنة رسول الله صلی الله
علیه وسلم فمن فعل ذالك
فهو کافر یجب قتاله حتی
یرجع الی حکم الله ورسوله
فلا یحکم سواه فی قلیل

کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے بادشاہ چنگیز خاں
سے اخذ کیے ہیں جس نے اپنے لیے یاسق
تیار کیا تھا اور وہ عبارت ہے اس مجموعہ
احکام سے جس میں یہودی نصرانی اسلامی
اور دوسری شریعتوں سے احکام لیے
گئے ہیں اور اسی میں بہت سے احکام
ایسے ہیں جو صرف چنگیز خاں کے غور وفکر
اور اس کی خواہشات کا نتیجہ ہیں۔ یہ مجموعہ
احکام اب اس کے خاندان کے مسلمان
سلاطین وحکام کے نزدیک وہ اصل
شریعت ہے جس کا وہ اتباع کرتے ہیں۔
اس مجموعہ کے احکام کو کتاب اللہ اور
سنت رسول اللہ کے احکام پر مقدم
رکھتے ہیں۔ اور جو ایسا کرے وہ
کافر ہے۔ اس سے اس وقت
تک مقابلہ واجب ہے جب تک وہ
اللہ اور اس کے رسول کے حکم کی طرف
پلٹ نہ آئے اور چھوٹے بڑے معاملہ
میں انھیں کے مطابق فیصلے سنہ

ولا کثیر۔ کرنے لگے۔

جو لوگ دین اسلام کے سیاسی پہلو کو اس کا ایک حقیر اور ضمنی جز و سمجھتے ہیں انھیں قرآن کی مندرجہ بالا آیتوں پر غور کرنا چاہیے۔ کیونکہ یہ آیتیں تو دین اسلام کے سیاسی پہلو کو کفر و اسلام کی کسوٹی قرار دے رہی ہیں۔ اس حقیقت کے مطالعہ کے لیے سورۂ مائدہ کا رکوع سات اور اس کا سیاق وسباق بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

بعثت محمدی کا مقصد

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ وَکَفٰی بِاللّٰهِ شَهِیْدًا۔ (الفتح۔ ۲۸)	وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تاکہ وہ اسے تمام ادیان پر غالب کرے اور (اس حقیقت پر) اللہ کی گواہی کافی ہے۔

سورۂ بقرہ اور سورۂ حدید کی آیتوں نے بالعموم تمام انبیاء کرام کے مقصد بعثت کو واضح کیا اور سورۂ فتح کی اس آیت نے بالخصوص خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت بعثت صریح الفاظ میں ہمیں بتائی ہے اور ٹھیک یہی غرض و غایت سورۂ توبہ آیت ۳۳ اور سورۂ صف آیت ۹ میں بھی بیان کی گئی ہے۔

جو بات دوسرے اسلوب بیان میں سورۂ انبیاء کی آیت ۱۸ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَی الْبَاطِلِ فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ۔ اور سورۂ السبا کی آیت ۴۹ قُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَمَا یُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا یُعِیْدُ

اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۸۱ وَقُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ط اِنَّ الْبَاطِلَ کَانَ زَهُوْقًا ط میں بتائی گئی تھی۔ ٹھیک وہی بات التوبۃ، الفتح اور الصف کی آیتوں میں اس صراحت کے ساتھ دہرائی گئی ہے کہ بعثتِ محمدی کی غرض وغایت ہی یہ ہے کہ دین حق کو تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کر دیا جائے۔

آیت الفتح کے آخری ٹکڑے وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا نے واضح کیا کہ بعثتِ محمدی کی اس غرض وغایت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ کیونکہ ان کو رسول بناکر اسی نے بھیجا ہے اور وہی جانتا ہے کہ انھیں بھیجنے کی غرض وغایت کیا ہے ـــــ اب اگر تمام دنیا مل کر بھی یہ کہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کا مقصد یہ نہیں تھا تو اس کی بات قابلِ سماعت نہ ہوگی۔

اقامت دین کا حکم

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ	مقرر کرد برائے شما از آئین آنچہ امر کردہ
مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْٓ	بود با قامت آں نوح را و آنچہ وحی فرستادیم
اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا	بسوئے تو و آنچہ امر کردیم با قامت آں
بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى	ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ بایں مضمون کہ
اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا	قائم کنید دین را و متفرق مشوید
تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ - (شوریٰ ۱۳)	در آں۔

فارسی کا ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ کا ہے۔ اس فارسی کا اردو ترجمہ یہ ہے :۔

تمہارے لیے وہ آئین مقرر کیا جس کی اقامت کا حکم دیا تھا نوح کو

اور جس کے لیے ہم نے وحی بھیجی ہے۔ تمھاری طرف اور جس کی اقامت کا ہم نے حکم دیا ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو بایں مضمون کہ قائم کرو دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو۔

اس آیت نے غلبۂ دین کی تمام تعبیرات وتفصیلات کو " اقامت دین" کی ایک جامع اصطلاح میں اکٹھا کر دیا ہے۔ یہ چونکہ ایک مختصر اور جامع اصطلاح ہے اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے لے کر آج تک تمام علمائے امت، دین اسلام کی ترویج وتنفیذ کے لیے یہی اصطلاح استعمال کرتے چلے آ رہے ہیں۔

اس آیت نے چند بہت بڑے درجے کے انبیاء و رسل کے نام لے کر یہ حقیقت واضح کر دی کہ یہ سب کے سب اس لیے بھیجے گئے تھے کہ اللہ کا بھیجا ہوا دین قائم کریں۔ اقامتِ دین ہی ان سب کا مقصد تھا۔ تمام انبیاء سے مدد کا وعدہ اللہ کے باغیوں کی شکست اور مغلوبیت اور وفاداران حق کی غالبیت وفتح کی غرض اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ اللہ کا دین قائم اور غالب ہو۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے انبیاء کرام بھیجے جاتے رہے اور جن کا سلسلہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا۔

ایک شبہے کا ازالہ

اگر کوئی سوال کرے کہ سورۂ شوریٰ کی اس آیت میں " الدین" سے کیا مراد ہے، آیا اس سے اصولِ دین مراد ہیں، یا اصول دین کے ساتھ شریعتیں بھی مراد ہیں۔ اگر صرف اصولِ دین مراد ہیں تو اس سے مکمل دین اسلام کی اقامت کا حکم

کیسے اخذ کیا جا سکتا ہے اور اگر شریعتیں بھی مراد ہیں تو اشکال پیش آتا ہے کہ جب شریعتیں مختلف رہی ہیں تو پھر آیت میں مذکور تمام انبیاء کو ایک ہی شریعت کی اقامت کا حکم دینا کس طرح صحیح ہوگا۔؟

اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ آیت میں یہ شبہہ پیدا کیا جا سکتا ہے پیدا ہوتا نہیں ہے اس لیے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرما رہا ہے کہ ہم نے نوحؑ، محمدؐ، ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو یہ حکم دیا کہ دین قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ ہر نبی کو اسی دین کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے جو اس پر نازل ہوا، اللہ کا فرشتہ ہر ایک پر الگ الگ وحی لایا، الگ الگ کتابیں نازل ہوئیں، الگ الگ ہدایتیں اور پیغامات بھیجے گئے۔ ایسا نہیں ہوا ہے کہ صرف ایک کتاب نازل ہوئی ہو اور ہر نبی کے ہاتھ میں وہی کتاب دے دی گئی ہو۔

اوپر قرآن کی آیتیں پیش کر کے تھوڑی تفصیل سے یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ہر رسول پر کتاب برحق اور میزان عدل اس لیے نازل کی گئی کہ لوگ عدل وانصاف کی روش پر قائم ہوں اور ان کے درمیان تمام من گھڑت اختلافات ختم کر دیے جائیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کتاب برحق میں کیا صرف اصول دین ہوتے تھے شریعت نہیں ہوتی تھی؟ کیا وہ کتاب تمام انفرادی و اجتماعی احکام پر مشتمل نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کو صرف عقائد، نماز و زکوٰۃ اور اخلاق حسنہ کے بیان پر ختم کر دیا جاتا تھا؟ مثال کے طور پر کیا توریت میں اجتماعی زندگی کے احکام وقوانین بیان کیے گئے ہیں؟ کیا کوئی پڑھا لکھا آدمی اس طرح کی بات سوچ بھی سکتا ہے؟ معلوم ہوا کہ ہر نبی اس مجموعۂ احکام کی اقامت کا مکلف ہوتا تھا جو اس پر

نازل کیے جاتے تھے اور اسی مجموعۂ احکام کو دین کہتے ہیں۔ شریعت دین سے کوئی الگ چیز نہیں ہوتی بلکہ اس میں داخل اور اس کا جز ہوتی ہے۔ پھر یہ بات کس منطق سے صحیح ہوگی کہ کل کی اقامت کا حکم دیا جائے اور جز اس سے خارج ہو۔

شریعتوں کے اختلاف کی نوعیت

شریعتوں کے اختلاف سے جو اشکال پیش آتا ہے اس کو حل کرنے کے لیے یہ جاننا چاہیے کہ انبیاء کرام کی شریعتوں میں اختلاف کی نوعیت کیا ہے۔ اس علم کے بعد یہ اشکال دفع ہو جائے گا ــــ بات یہ ہے کہ شریعتوں کے درمیان کوئی بنیادی اور اصولی اختلاف کبھی نہیں رہے بلکہ محض جزوی و فروعی اختلافات رہے ہیں۔ جہاں تک ایسے احکام و امور کا تعلق ہے جو انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو درست کرنے کے لیے ضروری ہیں وہ تمام شریعتوں میں موجود رہے ہیں کوئی ایک شریعت بھی ان سے خالی نہیں رہی ہے اور ایسے تمام احکام اصل دین میں داخل ہوتے تھے اس سے خارج نہیں ہوتے تھے ــــ مثال کے طور پر نماز ہر شریعت میں فرض رہی ہے۔ لیکن اس کے اوقات ارکان اور ہئیتوں میں فرق رہا ہے۔ روزہ ہر شریعت میں فرض رہا ہے، لیکن پورے ماہ رمضان کا روزہ شریعت محمدی میں فرض ہوا ہے۔ اسی طرح لوگوں کے درمیان اقامت عدل، مظلوموں کی دادرسی، مجرموں کی تعزیر، منکرین حق سے جہاد تمام شریعتوں کے ضروری اجزاء رہے ہیں لیکن ان کے ضابطوں اور تفصیلات میں جزوی اختلافات رہے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ دینی احکام کے انہیں جزوی اختلافات کے لحاظ سے شریعتوں کے درمیان امتیاز

قائم ہوتا ہے اور وہ ایک دوسرے سے الگ پہچانی جاتی ہیں۔ مثلاً شریعتِ محمدی شریعتِ موسوی سے الگ ایک مستقل بالذات شریعت ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان دونوں کے درمیان کوئی بنیادی اور اصولی اختلاف ہے

اس آیت کی تفسیر میں یہ جو لکھا گیا ہے کہ یہاں دین سے شرائع مراد نہیں ہیں تو اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ دینی احکام کی تفصیلات اور جزوی اختلافات مراد نہیں ہیں، کیونکہ ہر نبی کو اپنے وقت کے لحاظ سے شرعی احکام، جزوی اختلافات کے ساتھ دیے جاتے تھے۔ یہ مراد نہیں ہے کہ "الدین" سے نفسِ شریعت ہی خارج ہے۔ دین سے واقف کوئی شخص اس طرح کی بات نہیں کہہ سکتا۔ مفسرین کی تفسیر کے لحاظ سے اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر پچھلے نبی کو اگلے نبی کے ان مخصوص جزوی احکام و شرائع کی اقامت کا حکم نہیں دیا جاتا تھا جو اس پر نازل ہوئے اس لیے کہ پچھلے نبی پر وقت کے لحاظ سے مخصوص جزوی احکام الگ نازل ہوتے تھے، اور وہ انہیں کی اقامت کا مکلّف ہوتا تھا۔ چنانچہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلّم اس شریعت کی اقامت کے مکلّف ہیں جو آپ پر نازل ہوئی۔

چھٹی آیت

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ۔ (الحج۔ ۴۱)	یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکواۃ دیں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

اس آیت سے پہلے کی تین آیتیں ۳۸ تا ۴۰ بھی سامنے رہنی چاہئیں۔ میں یہاں صرف اُن کے ترجمے نقل کر رہا ہوں۔

یقیناً اللہ مدافعت کرتا ہے ان لوگوں کی طرف سے جو ایمان لاتے ہیں۔ یقیناً اللہ کسی خائن، کافر نعمت کو پسند نہیں کرتا (۳۸) اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے۔ کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے (۳۹) یہ وہ لوگ ہیں جو گھروں سے ناحق نکال دیے گئے ہیں صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے۔ اگر اللہ ان لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا اور معبد اور مسجدیں جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے سب مسمار کر ڈالی جاتیں، اللہ ضرور ان لوگوں کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ اللہ بڑا طاقتور اور زبردست ہے (۴۰)

ان تین آیتوں میں اہل حق کی طرف سے مدافعت اور ان کی مدد کا وعدہ کیا گیا ہے ــــ مسلمانوں کو قتال کی اجازت دی گئی ہے اور اللہ نے اپنی یہ قدیم سنت بھی بیان فرمائی ہے کہ وہ ہمیشہ اہلِ حق کو اہل باطل پر غلبہ عطا فرماتا رہا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو باطل پوری طرح چھا جاتا۔ یہاں تک کہ وہ عبادت گاہیں بھی مسمار کر ڈالی جاتیں جن میں اللہ واحد کا نام لیا جاتا اور اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد آیت ۴۱ میں اہلِ حق کو زمین میں سلطنت اور اقتدار بخشنے کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔ اس آیت میں خلفائے راشدین

کی تعریف بھی ہے اور خلافت راشدہ یا اسلامی حکومت کے مقاصد و فرائض بھی متعین کر دیے گئے ہیں۔ اقامتِ صلوٰۃ، ایتاءِ زکوٰۃ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی چار کلیات نے اپنے اندر تمام جزئیات کو سمیٹ لیا ہے۔

حقیقی اسلامی حکومت

مسلمانوں کے جن حکمرانوں نے خلوص کے ساتھ اس آیت کو اپنی حکومت کا نصب العین بنایا ہے انہیں کی حکومت درحقیقت اسلامی حکومت بنی ہے جنھوں نے اس سے غفلت برتی ہے، اُن کی حکومت خلافت راشدہ سے دور ہوگئی ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب خلیفہ بنائے گئے تو انھوں نے اس آیت کو نہ صرف یہ کہ اپنے سامنے رکھا، بلکہ اپنے ایک خطبے میں اس کی تفسیر بھی فرمائی۔

قال الصباح بن سوادۃ الکندی سمعت عمر بن عبدالعزیز یخطب وھو یقول اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ الآیۃ ثم قال الا انھا لیست علی الوالی وحدہ ولکن علی الوالی والمولی علیہ الا انبئکم بما لکم علی الوالی من ذالکم وبما للوالی علیکم منہ ان

صباح بن سوادہ کندی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو خطبہ دیتے ہوئے سنا وہ خطبے میں اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ کی پوری آیت پڑھ رہے تھے۔ پھر اس کے بعد انھوں نے فرمایا یہ آیت صرف والی و حاکم ہی پر ذمہ داری نہیں ڈالتی، بلکہ حاکم اور اس کے ماتحت دونوں پر ذمہ داریاں عائد کرتی ہے۔ میں بتاتا ہوں کہ حاکم پر تمھارا حق کیا ہے

لكم على الوالي من ذالكم
ان ياخذ بحقوق الله
عليكم وان ياخذ لبعضكم
من بعض وان يهديكم
للتي هي اقوم ما استطاع
وان عليكم من ذالك
الطاعة غير المبزوزة ولا
المستكره بها ولا المخالف
سرها علانيتها۔
(ابن کثیر جلد ۳)

اور تم پر حاکم کا حق کیا ہے۔ تمھارا حاکم پر حق یہ ہے کہ وہ تم سے اللہ کے حقوق وصول کرے اور تم میں سے بعض کا حق جو دوسرے پر ہو اسے بھی وصول اور بحد استطاعت سیدھی راہ کی طرف رہنمائی کرے اور تم پر حاکم کا حق یہ ہے کہ تم اس کی ایسی اطاعت کرو جو خوش دلی سے ہو نہ تو وہ کراہت و جبر کے ساتھ ہو اور نہ منافقانہ ہو۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کو جو اقتدار بخشتا ہے اس کی غرض وغایت اقامت عدل و اقامتِ دین کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی۔ یہ بات بھی پوری طرح واضح ہوگئی کہ غلبہ و اقتدار اور اقامت دین کے درمیان موقوف اور موقوف علیہ کے سوا دوسری کوئی نسبت نہیں پائی جاتی۔ اسلامی حکومت کے بغیر خدا کا اتارا ہوا دین بہ تمام وکمال قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اس موقوف علیہ کو حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسی کی تحصیل کے لیے اللہ نے کبھی اپنی قوتِ قاہرہ سے منکرین حق کو پامال کیا ہے اور کبھی اپنے وفاداروں کو جہاد کا حکم دے کر ان کی مدد فرمائی ہے اور منکرینِ حق کے مقابلے میں انھیں سربلند کیا ہے۔

اقامتِ دین احادیث میں

پہلی حدیث

(۱) پہلی حدیث جو میں یہاں نقل کر رہا ہوں، اس کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں دو جگہ روایت کیا ہے۔ کتاب التفسیر اور کتاب البیوع۔ صحیح بخاری کے علاوہ یہ حدیث انھوں نے الادب المفرد باب الانبساط الی النّاس میں بھی روایت کی ہے۔ امام احمد اور امام طبرانی نے بھی یہ حدیث حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے روایت کی ہے۔ امام دارمیؒ نے حضرت کعب اور عبداللہ ابن سلام سے اس کو روایت کیا ہے۔ میں یہ الفاظ کتاب التفسیر سے نقل کر رہا ہوں اور ترجمہ وہ نقل کر رہا ہوں جو علامہ سید سلیمان ندویؒ نے سیرت النبی جلد سوم میں کیا ہے:۔

حضرت عبداللہ بن عمرو نے کہا قرآن کی	عن عبد اللّٰہِ بن عمرو بن
یہ آیت کہ اے پیغمبر میں نے تجھ کو گواہ	العاص رضی اللہ عنہما
اور خوشخبری سنانے والا بنا کر اور امیوں	ان ھٰذِہِ الآیۃ التی
کا ماویٰ وملجا بنا کر بھیجا تو میرا بندہ ہے	فی القرآن یَآ اَیُّھَا النَّبِیُّ اِنَّآ
اور میرا رسول ہے اور میں نے تیرا نام	اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا

وَّنَذِيْرًا قَالَ فِي التَّوْرَاةِ
يَآاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ
شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا
وَّحِرْزًا لِّلْاُمِّيِّيْنَ اَنْتَ
عَبْدِيْ وَرَسُوْلِيْ سَمَّيْتُكَ
الْمُتَوَكِّلَ لَيْسَ بِفَظٍّ وَّلَا
غَلِيْظٍ وَّلَا سَخَّابٍ فِي الْاَسْوَاقِ
وَلَا يَدْفَعُ السَّيِّئَةَ بِالسَّيِّئَةِ
وَلٰكِنْ يَّعْفُوْا وَيَصْفَحُ وَلَنْ
يَّقْبِضَهٗ حَتّٰى يُقِيْمَ بِهِ
الْمِلَّةَ الْعَوْجَاءَ بِاَنْ
يَّقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ
فَيَفْتَحُ بِهَا اَعْيُنًا عُمْيًا
وَّاٰذَانًا صُمًّا وَّقُلُوْبًا غُلْفًا۔

خدا پر بھروسہ رکھنے والا رکھا وہ سخت
دل اور سنگ دل نہ ہوگا اور بازاروں
میں شور نہ کرے گا۔ وہ برائی کے
بدلے برائی نہ کرے گا بلکہ عفو اور
درگزر کرے گا اور اس وقت تک
خدا اس کی روح قبض نہ کرے گا
جب تک اس کے ذریعے وہ کج دین
کو سیدھا نہ کرے گا کہ لوگ کہنے
لگیں کہ وہ ایک خدا ہے اس کے سوا
کوئی نہیں۔ پس وہ اس دین سے
اندھی آنکھوں، بہرے کانوں
اور نا فہم دلوں کو کھول دے گا۔

اس حدیث سے بہ صراحت یہ بات معلوم ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش سے سیکڑوں سال پہلے توریت میں بھی آپ کے مقصد بعثت کے لیے اقامت دین ہی کی تعبیر اختیار کی گئی تھی اور اس میں یہ پیشین گوئی اور اللہ کا وعدہ موجود تھا کہ جب تک آپ اپنے مشن کو پورا نہ کرلیں، آپ کی وفات نہ ہوگی۔ نیز اس حدیث سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اقامتِ دین کا

جو کام آپ کے سپرد ہوا تھا وہ آپ کی بعثت سے لے کر وفات تک محیط ہے۔ مکے میں آپ نے دعوت اسلامی کا جو کام انجام دیا وہ بھی کج دین کو سیدھا کرنے کے لیے تھا اور مدینے آکر آپ نے منکرین حق سے جو جہاد بالسیف کیا وہ بھی کج دین کو سیدھا کرنے ہی کے لیے تھا۔ اس طرح یہ حدیث اقامتِ دین کے مفہوم پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ اوپر سورۂ فتح اور سورۂ شوریٰ کی جو آیتیں پیش کی گئی ہیں یہ حدیث ان آیتوں کی ایک اچھی شرح ہے۔

دوسری حدیث

(۲) امام بخاریؒ نے حضرت معاویہؓ سے یہ حدیث روایت کی ہے:۔

اِنِّیْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ اِنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ فِیْ قُرَیْشٍ لَا یُعَادِیْھِمْ اَحَدٌ اِلَّا کَبَّھُمُ اللّٰہُ عَلٰی وَجْھِہٖ مَا اَقَامُوا الدِّیْنَ (باب مناقب قریش)	میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ خلافت قریش میں اس وقت تک باقی رہے گی جب تک وہ اقامتِ دین کرتے رہیں گے۔ جو کوئی بھی ان سے دشمنی کرے گا اللہ اس کو منہ کے بل گرا دے گا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دین اسلام کی پیروی اور اس کے احکام وقوانین کی ترویج وتنفیذ کے لیے اقامتِ دین ہی کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ اسی کے ہم معنے حدیث حضرت ابو بکر صدیقؓ سے بھی مروی ہے علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:۔

وقد ورد فی حدیث ابی بکر الصدیق نظیر ما وقع فی حدیث معاویة ذکرہ محمد بن اسحٰق فی الکتاب الکبیر فذکر قصة سقیفة بنی ساعدة وبیعة ابی بکر وفیها فقال ابوبکر وان هذا الامر فی قریش ما اطاعوا الله واستقاموا علی امرہ

حضرت ابوبکر صدیقؓ کی حدیث میں بھی اس طرح کی بات کہی گئی ہے جو حدیث معاویہ میں ہے اس کا ذکر محمد بن اسحاق نے الکتاب الکبیر میں کیا ہے۔ انہوں نے سقیفہ بنی ساعدہ اور حضرت ابوبکر کی بیعت کا واقعہ لکھا ہے اور اسی میں یہ ہے کہ حضرت ابوبکر نے فرمایا۔ یہ خلافت قریش میں اس وقت تک باقی رہے گی جب تک وہ اللہ کی اطاعت کرتے اور اس کے حکم پر جمے رہیں۔

(فتح الباری، کتاب الاحکام، جلد ۱۲)

بخاری کی اس حدیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ امرائے قریش جب تک اقامتِ دین کرتے رہیں گے خلافت ان کے اندر باقی رہے گی اور ان کا ہر دشمن منہ کی کھائے گا۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ اگر وہ دین کو قائم نہیں رکھیں گے اور اس فریضے سے غفلت برتیں گے تو کمزور ہو جائیں گے اور خلافت ان سے چھن جائے گی یا کم سے کم یہ کہ وہ خلافت کے مستحق باقی نہ رہیں گے۔ یہ تصویر کا ایک رخ ہوا۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود امت مسلمہ کو دین اسلام پر قائم رکھنے کا ذریعہ کیا ہے اور یہ امت کس طرح اسلام پر باقی رہے گی اور جب تک اس سوال کا جواب نہ ملے، تصویر کا دوسرا رُخ واضح نہ ہوگا۔ احادیث

کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ یہ سوال آج پیدا نہیں ہوا بلکہ حضورؐ کے بعد یہ خلافت صدیقی ہی میں پیدا ہوا تھا اور صدیق اکبرؓ نے اس کا جواب بھی عنایت فرمایا تھا۔ یہ سوال و جواب ہم یہاں نقل کر رہے ہیں۔

تیسری حدیث

امام بخاری نے قیس بن ابی حازم سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکر قبیلہ احمس کی ایک عورت کے پاس گئے ان کا نام زینب تھا انہوں نے دیکھا کہ وہ کچھ بولتی نہیں ہیں پوچھا یہ کیوں باتیں نہیں کرتیں؟ لوگوں نے کہا۔ انہوں نے یہ نذر مانی ہے کہ حج ختم ہونے سے پہلے کسی سے باتیں نہ کریں گی۔ آپ نے زینب سے کہا۔ باتیں کرو اس لیے کہ چُپ کا حج جائز نہیں ہے۔ یہ جاہلیت کا عمل ہے۔ یہ سن کر انہوں نے گفتگو شروع کی۔ پوچھا آپ کون ہیں؟ کہا۔ میں مہاجرین کے گروہ کا ایک فرد ہوں۔ پوچھا۔ مہاجرین کے کس قبیلے سے تعلق ہے؟ کہا قریش سے۔ پوچھا۔ قریش کی کس شاخ سے تعلق ہے؟ آپ نے فرمایا۔ تم تو بہت سوال کرنے والی عورت ہو۔ میں ابوبکر ہوں۔ اس کے بعد جو سوال و جواب ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

قالت ما بقاءنا علی ھذا	خاتون نے پوچھا کہ جاہلیت کے بعد یہ جو
الامر الصالح الذی	صالح دین اللہ نے ہمیں عطا فرمایا ہے
جاءنا بہ بعد الجاھلیۃ	ہم کب تک اس پر قائم رہیں گے؟
قال بقاءکم علیہ	آپ نے جواب میں فرمایا تم اس
ما استقامت بکم	دین پر اس وقت تک قائم رہوگے

ائمتکم۔ (بخاری) (جلد ا باب ایام الجاہلیۃ)

جب تک تمہارے ائمہ خود اس دین پر قائم رہیں گے اور تمہیں قائم رکھیں گے۔

اس سوال وجواب پر غور کیجیے، سب سے پہلے جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان "ما اقاموا الدین" اور حضرت ابوبکرؓ کے ارشاد "ما استقامت بکم ائمتکم" میں الفاظ کے لحاظ سے تو فرق ضرور ہے لیکن مفہوم کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے جواب نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ امامت صالحہ یا خلافت راشدہ کے بغیر امت مسلمہ اسلام پر باقی نہیں رہ سکتی۔

حافظ ابنِ حجر کی تشریح

عرب خاتون کے سوال میں "الامر الصالح" کا جو لفظ آیا ہے اس کی تشریح حافظ ابن حجر نے یہ کی ہے:۔

ای دین الاسلام وما اشتمل علیہ من العدل واجتماع الکلمۃ ونصر المظلوم ووضع کل شیئ فی محلہ۔ (فتح جلد ۷)

یعنی امر صالح سے مراد ہے دینِ اسلام اور یہ دین، عدل و انصاف، وحدتِ کلمہ، مظلوم کی مدد اور ہر شے کو اپنے مقام و محل پر رکھنے کی جن خوبیوں پر مشتمل ہے وہ سب اس سے مراد ہیں۔

اس کے معنے یہ ہوئے کہ خاتون نے جو بات پوچھی تھی وہ یہ تھی کہ جاہلیت کے کفر و شرک، انتشارِ کلمہ اور ہر طرح کے ظلم و جور کے بعد اللہ نے جو دین حق

عطا فرمایا ہے اور جو عدل وانصاف، وحدت کلمہ، مظلوم کی مدد اور زندگی کے تمام معاملات میں حسنِ ترتیب کی خوبیوں پر مشتمل ہے۔ ہم ایک ایسے مکمّل دین پر کب تک قائم رہیں گے اور اس پر قائم رہنے کی صورت کیا ہوگی؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے وہ یہ ہے کہ جب تک حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں رہے گی جو خود اسلام کے احکام وقوانین پر عمل پیرا ہوں گے اور ساتھ ہی اپنے ماتحت بندگانِ خدا کو ان پر چلاتے رہیں گے۔ تم اس مکمّل دین پر قائم رہوگے تمہارا کلمہ ایک ہوگا۔ تم ایک جماعت بنے رہوگے۔ تمہارے معاشرے میں ہر طرف عدل وانصاف کا راج ہوگا اور تمھاری زندگی کی کل سیدھی رہے گی۔ یہ حکومت اسلامیہ، یہ امامت صالحہ، یہ خلافت راشدہ تمہارے اس مکمّل دین پر قائم رہنے کا واحد ذریعہ ہے۔

یہ بات جو انہوں نے فرمائی اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ حکومت اسلامی اسلام کے بہت سارے اجتماعی احکام کی موقوف علیہ ہے اس کے بغیر ان پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ عوام الناس کا وہی دین ہوتا ہے جو ان کے ملوک وامراء کا دین ہے۔ وہ زندگی کے معاملات میں انہیں کی پیروی کرتے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے جواب کی تشریح میں حافظ ابن حجر نے لکھا ہے :۔

ای لان الناس علی دین ملوکھم فمن حاد من	یہ اس لیے کہ لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں تو ائمہ وحکام

الائمۃ عن الحال مال و امال۔	میں سے جو بھی حق کی راہ سے ہٹے گا وہ باطل کی طرف مائل ہوگا اور دوسروں کو بھی مائل کرے گا۔
(فتح الباری جلد ۷)	

جو لوگ غلط فہمی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام پر عمل کرنے کے لیے حکومت ضروری نہیں، یا حکومت مطلوب نہیں انہیں اس سوال وجواب پر غور کرنا چاہیے۔ حضرت ابوبکرؓ کے جواب کی صرف عقل ونقل ہی تصدیق نہیں کرتے، بلکہ ہماری پوری تاریخ اس کی سچائی پر گواہ ہے۔

اس پوری بحث سے جو چیز نکھر کر سامنے آئی وہ یہ ہے کہ اقامتِ دین یعنی دینِ اسلام کی مکمّل پیروی کے لیے امامتِ صالحہ کا وجود انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ دین کی اقامت اس پر موقوف ہے۔

چوتھی حدیث

(۴) عن ابن مسعود قالَ من کان مستنًّا فلیستن بمن قد مات فان الحی لا یومن علیه اولئٰک اَصْحَاب محمد صلی الله علیه وسلم کانُوا افضل هٰذه الامة ابرها قلوبا داعمقها	حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی شخص کی پیروی کرنی ہی چاہے تو اسے اس کی پیروی کرنی چاہیے جو وفات پا چکا اس لیے کہ زندہ انسان کے بارے میں یہ اطمینان نہیں ہو سکتا کہ وہ فتنے میں مبتلا نہ ہوگا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے

قلوباً واقلها تکلفاً	یہ اصحاب (جو وفات پا چکے) اس
اختارهم الله لصحبة	امت کے سب سے زیادہ فضیلت
نبیه ولاقامة دینه.	رکھنے والے لوگوں میں تھے۔ ان کے
فاعرفوا لهم فضلهم	دل سب سے زیادہ نیک، ان کا علم
واتبعوهم علیٰ اثرهم	سب سے زیادہ گہرا اور ان کی زندگیاں
وتمسکوا بما استطعتم	تکلّف سے خالی تھیں اللہ نے
من اخلاقهم وسیرهم	انہیں اپنے نبی کی رفاقت اور
فانهم کانوا علی الهدیٰ	اپنے دین کی اقامت کے لیے
المستقیم۔	منتخب فرمایا تو اے لوگو! ان کے
مشکوٰة	فضل وشرف کو پہچانو۔ ان کے نشان
(باب الاعتصام بالکتاب والسنة)	قدم کی پیروی کرو اور حسب استطاعت
	ان کے اخلاق اور ان کی سیرتوں کو
	مضبوطی سے تھامو، اس لیے کہ وہ
	ہدایت کے سیدھے رستے پر تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ (م ۳۲ھ) کی یہ حدیث متعدد پہلوؤں سے قابل غور ہے۔ راقم الحروف نے ماہنامہ زندگی ستمبر ۶۲ء کے شمارے میں اس پر تھوڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ یہاں اس تفصیل کا اعادہ مقصود نہیں ہے۔ یہاں موضوعِ بحث کے لحاظ سے صرف ایک ٹکڑے اختارهم الله لصحبة نبیه ولاقامة دینه کی طرف توجہ دلانی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلّم اور ان کے ساتھ مل کر صحابۂ کرام نے مکے اور مدینے میں جو وسیع الاطراف کارنامے انجام دیے اور دعوت و تبلیغ سے لے کر بدر و حنین کے معرکوں تک نیز مظلومی و مغلوبی سے لے کر غلبہ و حکومت تک جو کچھ بھی کیا اس کے لیے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے صرف اقامت دین کی تعبیر اختیار کی اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک طرف یہ تعبیر قرآنی نص ”ان اقیموا الدین“ سے ماخوذ ہے اور دوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے پورے مشن کے لیے اس سے جامع ترین اور واضح ترین کوئی دوسری تعبیر نہیں ہو سکتی۔

اس حدیث کا ایک یہ پہلو بھی سامنے رہنا چاہیے کہ جب مدینے میں ریاست کی تشکیل اور بدر و حنین کے معرکے بھی اقامت دین میں داخل ہیں اور یقیناً داخل ہیں تو جماعت اسلامی ہند کے دستور میں اس کا جو مفہوم بیان کیا گیا ہے وہ بالکل درست ہے۔

اوپر جو حدیثیں گزری ہیں ان سے دو باتیں واضح ہوئیں۔ ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اقامت دین کے لیے ہوئی تھی اور دوسری یہ کہ اقامتِ دین کی جامع اصطلاح صرف قرآن میں نہیں بلکہ احادیث و آثار میں بھی استعمال ہوئی ہے۔

اسلامی مشن کی کامیابی

ہم قرآن کی آیتیں پیش کر کے یہ ثابت کر چکے ہیں کہ دعوتِ اسلامی کے ابتدائی دور ہی میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دے دی تھی کہ معاندینِ اسلام کو شکست

ہو گی اور اسلام غالب ہو کر رہے گا اس لیے کہ وہ غالب ہونے ہی کے لیے بھیجا گیا ہے۔ اب ہم دو حدیثیں پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہو گا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں بھی یہ بات صحابہ کرام رضؓ پر واضح کر دی تھی۔

پہلی حدیث

عن خباب بن الارت قال شكونا الى رسول الله صلى الله عليه وسلم وهو متوسد بردة له في ظل الكعبة قلنا له الا تستنصر لنا الا تدعوا الله لنا قال كان الرجل فيمن قبلكم يحفر له في الارض فيجعل فيه فيجاء بالمنشار فيوضع على راسه فيشق باثنين وما يصده ذالك عن دينه ويمشط بامشاط الحديد مادون لحمه من عظم او عصب وما يصده ذلك عن دينه والله ليتمن

خباب بن الارت رضؓ کہتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (اپنے مصائب) کی شکایت کی جب کہ آپ کعبہ کے سائے میں اپنی ایک چادر سے تکیہ لگا کر لیٹے ہوئے تھے۔ ہم نے کہا کیا آپ (اب بھی) ہمارے لیے اللہ سے مدد نہ مانگیں گے، کیا آپ ہمارے لیے دعا نہ کریں گے آپ نے فرمایا تم سے پہلے کے لوگوں میں مردِ مومن کا حال یہ تھا کہ اس کے لیے زمین میں گڑھا کھود کر اس میں اسے داخل کر دیا جاتا پھر آرا لا کر اس کے سر پر رکھا جاتا اور اسے دو ٹکڑوں میں چیر دیا جاتا لیکن یہ عذاب بھی اس کو اس کے دین سے نہ پھیرتا اور کسی کے جسم میں

ھذا الامر حتی یسیر الراکب من صنعاء الی حضرموت لا یخاف الا اللہ او الذئب علیٰ غنمہ ولکنکم تستعجلون ۔ بخاری (باب دلائل النبوۃ فی الاسلام)	لوہے کے کنگھے داخل کر کے اس کی ہڈی اور پٹھے تک کھرچ دیا جاتا لیکن یہ سزا بھی اس کو اس کے دین سے نہ پھیرتی ۔ خدا کی قسم اسلام پورا ہو کر رہے گا ۔ یہاں تک کہ سوار صنعا سے حضرموت تک سفر کرے گا اور اس کو خدا کے سوا کسی کا خوف نہ ہو گا یا یہ کہ اس کو اپنی بھیڑ بکریوں پر بھیڑیے کے حملے کا خوف ہو۔

بخاری کی ایک دوسری روایت میں اس کی تصریح ہے کہ مشرکین کی ایذا رسانیوں سے تنگ آکر حضورؐ سے شکایت کی گئی تھی اور اس میں یہ اضافہ بھی ہے کہ شکایت سن کر آپ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ بایں حال کہ آپ کا چہرۂ مبارک سرخ تھا۔ (باب مالقی النبی صلی اللہ علیہ وسلم وصحابہ من المشرکین بمکۃ)

یہ حدیث اس کش مکش کا پورا نقشہ سامنے لے آتی ہے جو مشرکین مکہ اور مسلمانوں کے درمیان جاری تھی اس حدیث کے چند واضح نکات یہ ہیں :۔

ا۔ مکے ہی میں حضورؐ کو یہ علم عطا کر دیا گیا تھا کہ جس مشن پر آپ کو مامور کیا گیا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا اور جب موقع آ گیا تو آپ نے خدا کی قسم کے ساتھ مؤکد کر کے یہ حقیقت صحابہ کرام پر بھی کھول دی اور اسلام کی کامیابی

کا حال ایک ایسی پیشین گوئی سے واضح فرمایا کہ جس کا تصور بھی اس وقت کے جزیرۃ العرب میں مشکل تھا۔

۲۔ اگلے مومنین صادقین کے مصائب و شدائد کی توضیح و تسکین و تسلّی کے لیے بھی تھی اور اس لیے بھی کہ راہِ حق کی مصیبتوں پر صبر کی قوت میں اضافہ ہو جائے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لیے ایک وقت مقرر کر دیا ہے اس لیے مصائب سے گھبرا کر عجلت پسندی مناسب نہیں ہے۔

مستشرقین کا ایک غلط خیال

غلبۂ اسلام سے متعلق قرآن کی مکی آیتیں اور اس مضمون کی مکی حدیثیں

مستشرقین اور دشمنِ اسلام پادریوں کے اس خیال اور اس شیطانی وسوسہ اندازی کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتی ہیں کہ مکےّ میں اسلام محض ایک مذہبی دعوت تھا لیکن مدینہ پہنچ کر اچانک وہ حکومت و ریاست میں بدل گیا۔ اس خیال کی نشر و اشاعت کے پیچھے دو مقاصد کام کر رہے ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانوں کے دلوں میں بھی یہ عقیدہ اتار دیا جائے کہ دین اور سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ دین کو سیاست سے تعلق نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ مکےّ میں اسلام، نعوذ باللہ منافقت کا لبادہ اوڑھے رہا، وہاں وہ بھیگی بلّی بنا ہوا لوگوں کو صرف خدا کی پوجا کی طرف بلاتا رہا اور مدینہ پہنچ کر جب طاقت حاصل ہوئی تو یک بیک اس نے آنکھیں بدل دیں اور شیر بن کر بے چارے مشرکین پر ٹوٹ پڑا۔

ان دو مقاصد میں جو حاصل ہو جائے، مستشرقین اور پادری کامیاب

ہو جائیں گے۔ دوسرے ملعون تر مقصد میں تو وہ کم کامیاب ہوئے ہیں لیکن پہلے مقصد میں انہوں نے اچھی خاصی کامیابی حاصل کر لی ہے، ان کے پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر مغربی تعلیم یافتہ مسلمانوں کی اکثریت دین کو ایک پرائیوٹ معاملہ اور اسے سیاست سے الگ سمجھنے لگی۔؛

مکی آیتیں (جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں گزر چکا) اور اس معنے کی حدیثیں بغیر کسی اشتباہ کے واضح کر رہی ہیں کہ دعوتِ اسلامی کی منزلِ مقصود کیا تھی اور مشرکین و مومنین کے درمیان جو کشمکش برپا ہوئی تھی اس کا انجام کیا ہونے والا تھا، مشرکین بھی اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اسلام کی دعوت محض پوجا پاٹ کی دعوت نہیں ہے اور مومنین پر بھی حضورؐ نے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ تم نے جو دین قبول کیا ہے اس کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔

دوسری حدیث

(۲) اسی معنے کی ایک حدیث حضرت عدی بن حاتم سے روایت کی گئی ہے:-

حضرت عدی بن حاتم رضؓ کہتے ہیں کہ ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے۔ اتنے میں ایک شخص آئے اور انہوں نے فقر و فاقہ کی شکایت کی پھر ایک دوسرے شخص آئے اور انہوں نے رہزنی یعنی راستوں کے غیر محفوظ ہونے کی شکایت کی۔ تب آپ نے حضرت عدی سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ اے عدی! کیا تم نے حیرہ (عرب کی ایک حکومت کا پایہ تخت) دیکھا ہے میں نے کہا۔ دیکھا تو نہیں ہے لیکن اس کے بارے میں بہت کچھ

سنا ہے۔ آپ نے فرمایا اگر تمھاری زندگی طویل ہوئی تو تم بالیقین یہ دیکھو گے کہ ایک ہودج سوار عورت حیرہ سے سفر کرے گی اور مکہ آکر کعبہ کا طواف کرے گی اور راستے میں اس کو خدا کے سوا اور کسی کا خوف نہ ہوگا۔ حضرت عدی کہتے ہیں کہ یہ سن کر میں نے اپنے دل میں کہا آخر قبیلہ طے کے وہ رہزن اور لٹیرے کہاں چلے جائیں گے جنہوں نے عراق و حجاز کے راستوں کو اپنی رہزنی اور فتنہ و فساد سے پُر آشوب بنا رکھا ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اگر تمہاری زندگی طویل ہوئی تو بالیقین دیکھو گے کہ کسریٰ کے خزانے فتح کر لیے گئے میں نے تعجب سے پوچھا۔ کیا کسریٰ بن ہرمز؟ آپ نے فرمایا۔ ہاں کسریٰ بن ہرمز! پھر آپ نے فرمایا۔ اگر تمہاری زندگی طویل ہوئی تو تم بالیقین دیکھو گے کہ کوئی شخص اپنی ہتھیلی میں سونا چاندی بھر کر نکلے گا کہ کوئی اس کو قبول کرے مگر اس کو قبول کرنے والا کوئی نہ ملے گا۔" (بخاری، باب دلائل النبوۃ)

اسلام کے غلبہ و اقتدار اور اس کی کامیابی سے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تمام پیشین گوئیاں، واقعات بن کر دنیا کے سامنے آچکی ہیں، اس حدیث سے ایک دوسری حقیقت یہ واضح ہوئی کہ حضورؐ کے بعد بھی جو غلبہ و اقتدار اور جو فتح و کامرانی مسلمانوں کو نصیب ہوئی وہ اسی دعوت کا فیضان اور اسی مشن کی تکمیل تھی جسے لے کر آپ مبعوث ہوئے تھے۔

اقامتِ دین اقامتِ قرآن کا نام ہے

اقامتِ دین کے مفہوم پر گزشتہ صفحات میں بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب ہم دو حدیثیں پیش کرتے ہیں جن سے اس کے مفہوم کی وسعت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

پہلی حدیث

عن یحی بن حصین قال سمعت جدتی تحدث انہا سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یخطب فی حجۃ الوداع وھو یقول ولو استعمل علیکم عبد یقودکم بکتاب اللہ فاسمعوا لہ واطیعوا۔
(مسلم، کتاب الامارۃ)

یحیٰ بن حصین کہتے ہیں کہ میں نے اپنی دادی کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حجۃ الوداع کے خطبہ میں یہ فرماتے ہوئے سنا۔ آپ نے فرمایا اور اگر تم پر کوئی غلام عامل بنایا جائے اور وہ تمہاری رہنمائی کتاب اللہ کے مطابق کرے تو اس کی بات سنو اور اطاعت کرو۔

دوسری حدیث

اسی مضمون کی حدیث ابن ماجہ نے ان الفاظ میں روایت کی ہے :-

عن ام الحصین قالت سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ان امر علیکم عبد حبشی مجدع فاسمعوا لہ واطیعوا ما قادکم بکتاب اللہ	حضرت ام الحصینؓ کہتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ اگر کوئی ناک کان کٹا ہوا حبشی غلام بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے تو اس وقت تک اس کی اطاعت کرو جب تک وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرتا رہے۔
(ابن ماجہ ابواب الجہاد، باب اطاعۃ الامام)	

اسی مضمون کی ایک حدیث گزشتہ اوراق میں گذری ہے جس میں مَا اَقَامَ فِیْکُمْ کِتَابَ اللّٰہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور ان دو مذکورہ بالا حدیثوں کے اندر قیادت کے صیغے استعمال ہوئے ہیں اور اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کے مطابق قیادت اور کتاب اللہ کی اقامت دونوں ایک ہی ہیں۔ چنانچہ بعض شارحین نے ما قادکم بکتاب اللہ کی تشریح ای یا مر بدین اللہ ویحکم بہ کے جملے سے کی ہے معلوم ہوا کہ اقامتِ دین، اقامتِ قرآن ہی کا نام ہے۔

قرآن سے استشہاد

خود قرآن میں اقامت کتاب اللہ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے جس کا مفہوم اقامتِ دین

ہی ہو سکتا ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰاةَ	اور اگر وہ توریت و انجیل اور جو کچھ
وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ	ان پر ان کے رب کی طرف سے نازل
مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ	ہوا ہے اسے قائم کرتے تو رزق ان کے
وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ۔	اوپر سے برستا اور نیچے سے ابلتا۔

پھر چند آیتوں کے بعد رکوع ۱۰، آیت ۶۸ میں فرمایا:۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ	کہہ دو کہ اے اہلِ کتاب تم کسی راہ
عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰاةَ	پر نہیں ہو یہاں تک کہ تم توریت و
وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ	انجیل کو قائم کرو اور اس کو جو تمہارے
اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔	رب کی طرف سے تم پر نازل ہوا ہے

توریت و انجیل اور قرآن کی اقامت کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کتابوں میں اللہ نے جو دین نازل فرمایا ہے پوری راست بازی کے ساتھ اس کی اقامت کی جائے اور آیت ۶۸ نے اہلِ کتاب پر یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ جب تک تم ان کتابوں کی اقامت نہیں کرتے، دینی لحاظ سے تم کچھ نہیں ہو اور تمھاری دینی زندگی لاشے محض ہے۔

افسوس یہ ہے کہ آج حامل قرآن امت کی اکثریت بھی ان آیتوں سے کوئی سبق نہیں لیتی اور اس کے ہزاروں دینددار افراد اقامتِ قرآن کی جدوجہد کے بغیر اپنے آپ کو دین کے بلند سے بلند مقام پر فائز سمجھتے ہیں۔

ان آیتوں اور ان احادیث نے اقامتِ دین کے مفہوم کو پوری طرح

روشن کر دیا ہے۔ اگر کتاب اللہ تمام انفرادی و اجتماعی احکام کی جامع ہے اور اگر اس میں اصلاح فرد سے لے کر معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل تک کے احکام موجود ہیں تو پھر یہ بات بلا اشتباہ ثابت ہے کہ اقامتِ دین کے مفہوم میں یہ تمام چیزیں داخل ہیں۔

حاصل بحث

اب تک جو کچھ لکھا جا چکا ہے اس کا حاصل یہ ہے:۔

۱۔ انبیاءِ کرام علیہم السّلام کی بعثت کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ وہ فرمانبرداروں کو بشارت اور نافرمانوں کو ڈرا وا سنا کر اپنا کام ختم کر دیں اور صرف یہ بھی نہ تھا کہ وہ غیر اللہ کو سجدہ کرنے، ان کی دہائی دینے اور اُن سے مدد طلب کرنے سے تو لوگوں کو منع کریں، لیکن زندگی کے دوسرے معاملات میں اُن کی شریعت سازی پر انکار نہ کریں، بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں میزان۔عدل اور کتاب برحق دے کر اس لیے بھیجتا رہا ہے کہ اس کے بندوں کی پوری زندگی اس دین کے مطابق بسر ہو جو اس نے نازل کیا ہے۔

۲۔ اللہ کے پیغام اور اس کی کتاب برحق کی حیثیت کسی ایسی سفارش کی نہ تھی جس کو رد کر دینے پر دنیا میں اس کا کوئی نوٹس نہ لیا جائے، بلکہ اس کی حیثیت فرمان شاہی کی تھی جس کا انکار خدا کے خلاف بغاوت اور چیلنج کے مترادف تھا اور اس کا وعدہ یہ تھا کہ وہ دینِ باطل کو مغلوب و نگوں سار اور دینِ حق کے حامیوں کو غالب و سر بلند کرے گا۔

۳۔ رسولوں اور ان کے ماننے والوں کو نجات دینے اور انہیں غلبہ واقتدار عطا کرنے کی غرض و غایت یہ تھی کہ اس کا بھیجا ہوا دین غالب اور قائم ہو کیونکہ غلبہ واقتدار، شریعت الٰہی کی تنفیذ کے لیے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ باطل اقتدار کو ختم کیے بغیر دین حق کی مکمل پیروی ممکن نہیں ہے۔

۴۔ اصل دین جس پر تمام انبیاءِ کرامؑ متفق رہے ہیں، صرف عقائد و عبادات اور اخلاق حسنہ نہیں ہیں، بلکہ وہ تمام انفرادی و اجتماعی احکام بھی ہیں جن پر فرد اور معاشرے کی اصلاح موقوف ہے۔ ان میں منکرین حق کے خلاف جہاد، لوگوں کے درمیان اقامتِ عدل اور مجرموں کی تعزیر کے احکام بھی داخل ہیں۔ مختلف شرائع کے درمیان اختلاف محض جزدی رہا ہے۔ ان کے درمیان بنیادی وجوہری اختلاف نہ تھا۔

۵۔ انبیاءِ کرامؑ کے مقصدِ بعثت کے لیے "اقامتِ دین" کی جامع اصطلاح صرف قرآن ہی میں استعمال نہیں ہوئی ہے، بلکہ احادیث و آثار میں بھی استعمال کی گئی ہے اور علماءِ امت برابر استعمال کرتے چلے آرہے ہیں۔

۶۔ خدا کا بھیجا ہوا دین محض پوجا پارٹ کا کوئی مذہب نہیں ہے، بلکہ اس کے دائرے میں پوری زندگی داخل ہے اس لیے اقامتِ دین کا مفہوم بھی محدود نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔

۷۔ اب امتِ مسلمہ کے لیے اقامتِ دین کے معنے اقامت قرآن کے ہیں۔ جب تک قرآن و سنت کے تمام قوانین نافذ نہ ہو جائیں، اقامتِ دین کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔

واضح دلائل

ان تمام نکات کے دلائل تھوڑی تفصیل کے ساتھ تحریر کیے جا چکے ہیں اور اس سلسلے میں کتاب وسنت کے نصوص پیش کیے گئے ہیں۔ یہاں یہ ظاہر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں نے جو آیتیں پیش کی ہیں اُن کے معنے ومفہوم سے متعلق مفسرین کی عبارتیں بہت کم نقل کی ہیں اور ایسا میں نے دو وجوہ سے بالقصد کیا ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اگر میں اُن کی عبارتیں نقل کرتا تو پیش نظر کتاب بہت ضخیم ہو جاتی۔ یہ بات نہیں ہے کہ میں نے مستند تفسیریں پڑھی نہ ہوں، اور جو کچھ لکھا ہو بطورِ خود لکھا ہو، بلکہ میں نے جو کچھ لکھا ہے مستند تفسیریں پڑھ کر لکھا ہے — دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ آیتیں اپنے معنی ومفہوم پر خود اتنی صراحت سے دلالت کرتی ہیں کہ کسی تفسیری عبارت کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ایسی آیتوں سے تعرض ہی نہیں کیا ہے، جن میں کسی گہرے استنباط کی حاجت ہو۔ اس کے علاوہ اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ جو لوگ کھلے ذہن سے مسئلے پر غور کرنا چاہیں اُن کے سامنے دلائل آجائیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو ماننا نہ چاہیں، یا جن کے نزدیک دلیل وہی ہوتی ہے جسے وہ دلیل قرار دیں، تو ظاہر ہے ایسے لوگ میرے پیشِ نظر نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔

تخلیق انسانی کا مقصد

یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ہر نبی کی اُمت کا مقصدِ زیست، فریضۂ حیات اور نصب العین وہی ہوتا ہے جو خود اس نبی کا رہا ہے۔ نبی کی وفات کے بعد اُن پر ایمان لانے والے لوگ اس بات کے ذمّہ دار ہوتے ہیں کہ وہ اس

مشن کو جاری رکھیں جس کے لیے اللہ نے اپنا رسول مبعوث کیا تھا۔ ہم تفصیل سے لکھ چکے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد اقامت دین اور اظہارِ دین تھا۔ اس لیے خود بخود یہ بات طے ہوجاتی ہے کہ امت مسلمہ کا فریضۂ حیات اور نصب العین بھی اقامت دین ہی ہو سکتا ہے کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی اسی طرح ہم اقامتِ دین کے مفہوم پر بھی تفصیل سے لکھ چکے۔ لیکن تمام بنی نوع انسان کے مقصدِ وجود کے بارے میں بالعموم اور امت مسلمہ کے منصبِ حیات کے بارے میں بالخصوص قرآن کریم نے اجمال پر اکتفا نہیں کیا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کی تفصیل بھی سامنے آجائے۔

انسان اس زمین پر اللہ کا نائب ہے

دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟ اس اہم سوال کا صحیح جواب وہ ابتدائی سرا ہے کہ یہ اگر گم ہوجائے تو پھر زندگی کی گتھی الجھتی ہی چلی جاتی ہے اور انسان کی زندگی کا رویہ بگڑتا ہی چلا جاتا ہے اور اگر اسے یہ ابتدائی سرا مل جائے اور شعور کے ساتھ وہ مضبوطی سے اس کو تھام لے تو اس کی زندگی کی گتھی سلجھ جاتی اور وہ اپنے کمالِ ارتقا تک پہنچ جاتا ہے۔ قرآن کریم نے ہمیں اس سوال کا صحیح جواب عطا کیا ہے اور اگر وہ عطا نہ کرتا تو انسان کے پاس کوئی دوسرا ذریعہ نہ تھا جس سے وہ صحیح جواب تک پہنچ سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان کی حیثیت اس زمین پر خلیفۃ اللہ کی ہے، وہ خدا کا نائب بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس کا فریضۂ حیات کارِ خلافت کی انجام دہی ہے۔ تخلیق انسانی کے اس راز سے سورۂ بقرہ کے چوتھے رکوع میں پردہ

اٹھایا گیا ہے:-

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ (بقرہ: ٣٠)

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔

سورۂ بقرہ، آیت ٣٠ تا ٣٩ کا متن اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔ ہم یہاں صرف ترجمہ نقل کرتے ہیں:-

اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔ انہوں نے کہا۔ کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خونریزی کرے اور ہم تو تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہی ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہی ہیں۔ اس نے کہا، میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ (٣٠) اور اس نے سکھا دیے آدم کو سارے نام، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام سے آگاہ کرو۔ (٣١) انہوں نے کہا تو پاک ہے، ہمیں تو تو نے جو کچھ بتایا ہے اس کے سوا کوئی علم نہیں، بے شک تو ہی علم و حکمت والا ہے۔ (٣٢) کہا۔ اے آدم! ان کو بتاؤ ان چیزوں کے نام۔ تو جب اس نے بتائے ان کو ان چیزوں کے نام تو اس نے کہا۔ کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں اور

میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو اور جس کو تم چھپاتے تھے۔ (۳۳) اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا فرشتوں سے آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے، اس نے انکار کیا اور گھمنڈ کیا اور کافروں میں سے بن گیا۔ (۳۴) اور ہم نے کہا اے آدم! تم اور تمہاری بیوی دونوں رہو جنت میں اور اس میں سے کھاؤ، فراغت کے ساتھ جہاں سے چاہو اور اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا، ورنہ ظالموں میں سے بن جاؤ گے (۳۵) تو شیطان نے ان کو وہاں سے پھسلا دیا اور ان کو نکلوا چھوڑا اُس عیش و آرام سے جس میں وہ تھے۔ اور ہم نے کہا کہ اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے لیے ایک خاص وقت تک زمین میں رہنا بسنا اور کھانا پینا ہے۔ (۳۶) پھر آدم نے پا لیے اپنے رب کی طرف سے چند کلمات تو اس نے اس کی توبہ قبول کی۔ بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔ (۳۷) ہم نے کہا، اترو یہاں سے سب، تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ (۳۸) اور جو کفر کریں گے اور جھٹلائیں گے میری آیتوں کو وہی لوگ دوزخ والے ہیں، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (۳۹)

سورۂ بقرہ کی یہ آیتیں، اس دنیا میں انسان کی حیثیت، صحیح، رویۂ زندگی

اور اس کے انجام کی واقفیت کے لیے بے حد اہم ہیں۔ ان آیتوں کے تمام مشتملات و مضمرات پر گفتگو مقصود نہیں۔ زیر بحث مسئلے سے متعلق تھوڑی سی تشریح یہاں کرنی ہے۔ آیت کے پہلے ٹکڑے کی تفسیر میں مولانا صدر الدین اصلاحی لکھتے ہیں:۔

خلیفہ اس شخص کو کہتے ہیں جو کسی کی ملک میں اس کے سونپے ہوئے اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا، بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ذاتی منشاء کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا، بلکہ اس کا کام مالک کے منشاء کو پورا کرنا ہوتا ہے اگر وہ خود اپنے کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کیے ہوئے اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے، یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کر کے اس کی منشاء کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے تو یہ سب نمک حرامی، غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ انسان اس زمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔ یہ منصب خلافت اس کے تاجِ عظمت کا وہ درخشاں گوہر ہے جو کسی بھی مخلوق کو نہیں بخشا گیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے سلسلہ بیان میں اپنی اس بے نظیر نعمت کا ذکر بھی ایک خاص اہتمام سے فرمایا۔ پھر اسی کی جناب سے ملائکہ کے سامنے تخلیق آدم

سے پہلے ہی اس کے ارادے کا ذکر اور وہ بھی اسی منصب خلافت ہی کا نام لے کر اس کی غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ شاید انسان کے اس نوعی شرف کا اس سے اونچا تخیل اور کوئی نہیں ہو سکتا اب انسان کی جس طرح یہ خود شناسی اور اپنی تحقیر ہے کہ وہ ان مخلوقات کے آگے سر نیاز خم کر دے جن پر اس کو نیابتی آقائی اور حکمرانی کا مقام بخشا گیا ہے اسی طرح اس کی یہ خود فریبی اور خیانت اور غداری ہو گی کہ وہ اپنے اصل مالک کی مرضیات سے بے نیاز ہو کر من مانے طریقے سے زندگی بسر کرنے لگے۔

اس سلسلے میں انسان کی حقیقت اور کائنات میں اس کی اصل حیثیت ٹھیک ٹھیک بیان کر دی گئی ہے اور نوعِ انسان کی تاریخ کا وہ باب پیش کر دیا گیا ہے جس کے معلوم کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ انسان کو میسّر نہیں ہے۔ اس باب سے جو اہم نتائج حاصل ہوتے ہیں وہ ان نتائج سے بہت زیادہ قیمتی اور فلاح بخش ہیں جنہیں زمین کی تہوں سے متفرق ہڈیاں نکال کر اور انھیں قیاس سے ربط دے کر اخذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ (تیسیر القرآن، زندگی، جلد ۵، شمارہ ۲، دسمبر ۱۹۶۵ء)

آیت (۳۰) کے دوسرے ٹکڑے قَالُوٓا اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَیَسۡفِكُ الدِّمَآءَ کی تفسیر میں مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:۔

قرآن مجید کی اصطلاح میں فساد فی الارض کا مفہوم یہ ہے کہ

زمین کا نظم ونسق اللہ تعالیٰ کے احکام وقوانین کے مطابق چلانے کے بجائے اس کو من مانے طریقے پر چلایا جائے، خدا کی شریعت کی نافرمانی کی جائے اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی جائے۔ زمین کے اصلی حکمراں کی مرضی نظر انداز کی جائے اور خود اپنی مرضی چلائی جائے۔ یہ چیز بجائے خود فساد فی الارض اور بغاوت ہے، عام اس سے کہ یہ دھینگامشتی اور سرکشی کے ساتھ واقع ہو یا کسی فکر وفلسفہ کے تحت، پرامن طریقے پر۔ اس زمین کا اصلی حکمراں اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کی حیثیت اس کے اندر اصل حکمراں کی نہیں بلکہ اصل حکمراں کے نائب کی ہے۔ اس وجہ سے اس زمین کے امن و عدل کا انحصار اس چیز پر ہے کہ اس کے ہر گوشے میں خدائی قانون ہی چلے۔ اگر اس کے کسی حصے میں خدا کا قانون باقی نہیں رہا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس حصے میں بغاوت پھوٹ رہی ہے اور یہ چیز اس پوری زمین کے لیے خطرہ ہے۔

خونریزی فساد فی الارض کا قدرتی نتیجہ ہے۔ جب خدا کا قانونِ عدل باقی نہیں رہے گا تو لازماً اس کی جگہ انسان کی اپنی خواہشات کی فرمانروائی ہوگی۔ اس چیز کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ کسی شخص کی بھی جان، مال یا اس کی آبرو کے لیے کوئی ضمانت باقی نہیں رہے گی کسی خطۂ زمین کے مفسدین بالفرض کوئی ایسا نظام بنا بھی لیں جس میں باہم دگر ایک دوسرے کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دے دیں تو اس سے وہ اپنے لیے تو

ایک تحفظ کی شکل پیدا کر لیں گے لیکن دوسروں کے لیے وہ بدستور خطرہ ہی بنے رہیں گے۔ اِن کی مثال ڈاکوؤں کے ایک جتھے کی ہوگی، جس کے افراد نے آپس میں تو یہ سمجھوتہ کر رکھا ہے کہ ایک دوسرے کے جان و مال پر دست درازی نہیں کریں گے، لیکن اس جتھے سے باہر والوں کے جان و مال کو ان کی چیرہ دستیوں سے بچانے والی کوئی چیز بھی نہ ہوگی۔ تمام عالم انسانی اور پورے کرۂ ارضی کے تحفظ کی ضمانت صرف خدا کا قانون ہی دے سکتا ہے جو سب کے جان و مال کی حفاظت کرتا ہے اور سب کو یکساں پابند کرتا اور آزادی بخشتا ہے۔

فرشتوں نے انسان کے بارے میں اس اندیشے کا اظہار اس کے خلیفہ ہونے کی بنا پر کیا اس لیے کہ خلیفہ کے لفظ کے اندر یہ چیز چھپی ہوئی ہے کہ اس کو ایک خاص حد کے اندر اللہ تعالےٰ کی طرف سے اختیارات تفویض ہوں گے۔ فرشتوں نے محسوس کیا کہ اختیار کو استعمال کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کو پاکر انسان بہک سکتا ہے اور اس بہکنے کا نتیجہ زمین میں بدامنی اور فساد کی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے۔

(ماہنامہ 'میثاق'، جلد ۲، عدد ۴، اپریل ۱۹۶۰ء)

میں نے اپنے سے زیادہ فہم قرآن رکھنے والے دو علماء کے یہ طویل اقتباسات اس لیے نقل کیے ہیں کہ میرے نزدیک امت مسلمہ کے فریضہ حیات کو صحیح طور پر

سمجھنے کے لیے انسان کے منصبِ خلافت کو اچھّی طرح سمجھ لینا ضروری ہے۔ اس کو نہ سمجھنے یا اس کا انکار کرنے والے اچھّے اچھّے دیندار مسلمانوں کا رویۂ زندگی بھی بہت ہی محدود اور ناقص ہو کر رہ جاتا ہے۔

نیابتِ الٰہی کس چیز میں؟ یہ دوسرا اہم سوال ہے جو اس مقام پر سامنے آتا ہے اور اس پر غور کر لینا بھی انتہائی ضروری ہے۔ اس سوال پر غور نہ کرنے کی وجہ سے کچھ لوگوں کو لفظ 'عبادت' کا مفہوم سمجھنے میں بھی الجھن پیش آتی ہے۔ اوپر جو اقتباسات نقل کیے گئے ہیں ان میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔ لیکن نمایاں نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ اس سوال کو نمایاں کر کے اس کا جواب دیا جائے اور بتایا جائے کہ انسان کو خلافتِ ارضی کس مقصد سے عطا کی گئی ہے۔ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ کسی کو نائب مقرر کرنے کا مطلب کیا ہوتا ہے اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ جو کام اصل کو انجام دینا چاہیے تھے وہ اب اس کا مقرر کردہ نائب انجام دے گا۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر غور کیجیے۔

اس دنیا میں خدا کا فرمانبردار بندہ بہت سے کام کرتا ہے۔ مثلاً وہ خدا کو پوجتا ہے، اس کی پرستش کرتا ہے، اس کے سامنے رکوع اور اس کے حضور سجدے کرتا ہے، اس کی تسبیح و تقدیس میں رطب اللسان رہتا ہے اور اس کے سامنے انتہائی عاجزی و نیازمندی کے ساتھ دستِ سوال دراز کرتا ہے لیکن کیا ان کاموں میں وہ خدا کا خلیفہ اور نائب ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہو گا کیونکہ خلافت اللہ کی نیابت ہے اور ان کاموں میں اس کی نیابت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پرستش مخلوق کا خاصہ ہے، خدا کی صفت نہیں۔ اللہ کی ذات

اس سے بَری ہے۔ اسی طرح انسان کھاتا ہے، پیتا ہے، سوتا ہے، جاگتا ہے اور دوسری بشری حاجات پوری کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کاموں میں وہ خدا کا نائب نہیں ہے تو اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کس چیز میں خدا کا خلیفہ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس زمین پر خدا کے احکام کی تنفیذ، لوگوں کے درمیان اقامتِ عدل اور دنیا کے انتظام کی اصلاح میں خدا کا نائب ہے اور اسی مقصد سے اسے خلافتِ ارضی عطا کی گئی ہے۔ فرشتوں پر انسان کو جو فضیلت حاصل ہے اسی خلافت ارضی اور اس سے متعلق اس جامع علم کی وجہ سے جو اللہ نے صرف انسان کو عطا فرمایا ہے ورنہ جہاں تک خدا کی پرستش اور اس کی تسبیح و تقدیس کا تعلق ہے، فرشتے انسان سے بہت آگے ہیں۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سورۂ بقرہ کی آیت ۳۰، ۳۱ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدم کو ہر ایک چیز کا نام مع اس کی حقیقت اور خاصیت کے اور نفع و نقصان کے تعلیم فرمادیا اور یہ علم ان کے دل میں بلا واسطہ کلام القا کر دیا۔ کیونکہ بدون اس کمالِ علمی کے خلافت اور دنیا پر حکومت کیونکر ممکن ہے۔ اس کے بعد ملائکہ کو اس حکمت پر مطلع کرنے کی وجہ سے ملائکہ سے امورِ مذکور کا سوال کیا گیا کہ اگر تم اپنی اس بات پر کہ تم کارِ خلافت انجام دے سکتے ہو، سچے ہو تو ان چیزوں کے نام و احوال بتاؤ" لیکن انھوں نے اپنے عجز و قصور کا اقرار کیا اور خوب سمجھ گئے کہ بدون اس علم عام کے کوئی کارِ خلافت زمین میں نہیں کر سکتا

اور اس علم عام سے قدر قلیل ہم کو اگر حاصل ہو ابھی تو اتنی بات سے ہم قابلِ خلافت نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ کر کہہ اٹھے کہ تیرے علم و حکمت کو کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

آیت کے فائدے یہ نکلتے ہیں:۔

اس سے علم کی فضیلت، عبادت پر ثابت ہوئی۔ دیکھیے عبادت میں ملائکہ اس قدر بڑھے ہوئے ہیں کہ معصوم، مگر علم میں چونکہ انسان سے کم ہیں، اس لیے منصبِ خلافت انسان کو عطا ہوا اور ملائکہ نے بھی اس کو تسلیم کیا۔ اور یہ ہونا بھی یوں ہی چاہیے۔ کیونکہ عبادت تو خاصۂ مخلوق ہے، خدا کی صفت نہیں۔ البتہ علم خدا کی صفت اعلیٰ ہے۔ اس لیے قابل خلافت یہی ہوئے۔ کیونکہ ہر خلیفہ میں اپنے مستخلف عنہ کا کمال ہونا ضروری ہے۔

قدیم مفسّرین کیا فرماتے ہیں

اب آئیے، یہ دیکھ لیں کہ ہمارے قدیم مفسّرین کیا کہتے ہیں۔ امام بغویؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

والمراد بالخلیفۃ ھھنا آدم وسماہ خلیفۃ لانہ خلف الجن ای جاء بعدھم وقیل لانہ یخلفہ غیرہ والصحیح انہ خلیفۃ اللہ فی ارضہ لاقامۃ احکامہ	اس آیت میں خلیفہ سے مراد آدمؑ ہیں اور ان کو خلیفہ اس لیے کہا گیا کہ وہ جنات کے بعد ان کے جانشین بنائے گئے ہیں، اور ایک قول یہ ہے کہ ان کو خلیفہ اس لیے کہا گیا کہ دوسرے لوگ ان کے جانشین ہونے والے تھے اور صحیح بات

وتنفیذ قضایاہ
(معالم التنزیل)

یہ ہے کہ حضرت آدم اللہ کی زمین میں اس کے احکام کی اقامت اور اس کے فیصلوں کی تنفیذ کے لیے اللہ کے خلیفہ تھے

تفسیر خازن میں اس کی تائید ان الفاظ میں کی گئی ہے:۔

والصحیح انہ انما سمی خلیفۃ لانہ خلیفۃ اللہ فی ارضہ لاقامۃ حدودہ وتنفیذ قضایاہ
(لباب التاویل)

اور صحیح قول یہ ہے کہ حضرت آدم خلیفہ سے اس لیے موسوم ہوئے کہ وہ اللہ کی زمین میں اس کے حدود کی اقامت اور اس کے فیصلوں کو نافذ کرنے کے لیے اللہ کے خلیفہ تھے

"خلیفہ" کی تفسیر جلالین میں یہ ہے:۔

یخلفنی فی تنفیذ احکامی فیہا وھو آدم
(جلالین)

وہ زمین پر میرے احکام کو نافذ کرنے میں میری نیابت کرے گا اور وہ خلیفہ آدم ہیں۔

تفسیر بیضاوی کی عبارت یہ ہے:۔

والخلیفۃ من یخلف غیرہ وینوب منابہ والمراد بہ آدم علیہ السلام لانہ کان خلیفۃ اللہ فی

اور خلیفہ اس کو کہتے ہیں جو دوسرے کا قائم مقام اور اس کا نائب ہو اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں اس لیے کہ وہ زمین میں اللہ کے خلیفہ تھے

ارضہ وکذٰلک کل نبی استخلفهم فی عمارة الارض وسیاسة الناس وتکمیل نفوسهم و تنفیذ امره فیهم لالحاجة به تعالیٰ الی من ینوبه بل لقصور المستخلف علیه عن قبول فیضه وتلقی امره بغیر وسط (بیضاوی)

اور اسی طرح ہر نبی اللہ کے خلیفہ تھے اللہ نے تمام انبیاء کو زمین کی آبادی لوگوں کے امور کی تدبیر، ان کے نفوس کی تکمیل اور اُن پر احکامِ الٰہی کی تنفید کے لیے اپنا خلیفہ بنایا تھا اس لیے نہیں کہ اللہ کسی نائب کا محتاج ہے بلکہ اس لیے کہ جن لوگوں پر اس نے اپنا نائب مقرر کیا وہ بلا واسطہ اس کے اوامر اور اس کے فیض کو قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔

اسی طرح کی عبارت روح المعانی میں لکھی ہے، جس کے ابتدائی جملے یہ ہیں:۔

(خلیفۃ) انہ خلیفۃ اللّٰہ فی ارضہ وکذا کل نبی (روح المعانی)

آدمؑ زمین میں اللہ کے خلیفہ تھے اور اسی طرح تمام انبیاءؑ اللہ کے خلیفہ تھے۔

مفسرین کرام کی ان عبارتوں سے پوری وضاحت کے ساتھ معلوم ہوا کہ نہ صرف حضرت آدمؑ، بلکہ تمام انبیاء کرام علیہم السّلام کو جو خلافتِ ارضی عطا کی گئی تھی اس کا مقصد یہ تھا:۔

زمینؔ کی آبادی، لوگوںؔ کے لیے سیاست کی انجام دہی (یعنی ان کے تمام امور و معاملات کا انتظام اور تدبیر) ان کے نفوس

کی تکمیل۔ اللہ کے شرعی فیصلوں کی تنفیذ اور حدودِ الٰہی کی اقامت
اقامتِ دین کا مفہوم اس کے سوا اور کیا ہے؟ ہم نے گزشتہ صفحات میں قرآن وحدیث کے نصوص پیش کر کے بعثتِ انبیاء کے مقصد پر جو گفتگو کی ہے مفسرین کرام کی عبارتیں عین اس کے مطابق ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بعثتِ انبیاء ہی کا مقصد نہیں، بلکہ تخلیق انسانی کا مقصد بھی اقامت دین ہی تھا۔

حضرت آدم کے واسطے سے ان کی پوری ذرّیت قیامت تک کے لیے خلافت ارضی کی حامل ہے۔ اس لیے نہ صرف امت مسلمہ بلکہ مقصدِ تخلیق کے لحاظ سے تمام بنی نوعِ انسان کا فریضۂ حیات اور اس کا مقصد وجود اقامت دین کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس زمین پر انسان بھیجا ہی اس لیے گیا ہے کہ وہ خدا کے دین و شریعت اور اس کے آئین وقانون کی پابندی کرے اور اسی کے مطابق دنیا کا انتظام چلائے۔

قرآن سے استشہاد

خود سورۂ بقرہ کی منقولہ بالا آیتوں میں اور قرآن کی دوسری آیتوں میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ زمین میں انسان کو کس غرض سے خلیفہ بنایا گیا ہے۔ فرشتوں کے اس استفہام پر غور کیجیے جو انھوں نے انسان کی خلافت کے بارے میں کیا تھا۔ انھوں نے رب العٰلمین سے سوال کیا۔

اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ (بقرہ ۵)	کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خونریزی کرے۔

غور کیجیے، فرشتوں کو انسان کے بارے میں یہ اندیشہ کیوں پیدا ہوا؟

اور انہوں نے انسان کی جس کمزوری اور اس کے جس عیب کا ذکر کیا اس کا تعلق کس چیز سے ہے ؟ کیا اس کا تعلق حکومت و سیاست اور انتظام مملکت سے نہیں ہے ؟ حکومت نام ہی ہے اس ادارے کا جو ملک کے انتظام کو درست رکھے، اس کو فساد سے بچائے اور باشندگانِ ملک کی جان و ملک کی حفاظت کر کے امن و امان قائم کرے۔ فرشتوں کا شبہہ یہ تھا کہ جو مخلوق تیری زمین کے انتظام کو بگاڑ دے گی اور امن و امان کو درہم برہم کرے گی، آخر تو اس کے ہاتھ میں عنانِ حکومت کس مصلحت سے دے رہا ہے۔

فرشتوں کے اس سوال کے تحت اوپر ہیں نے مولانا امین احسن اصلاحی کی تفسیر کا جو اقتباس دیا ہے اس پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ تفسیر کبیر میں بھی ہمیں فرشتوں کے سوال کی ایک توجیہہ ان الفاظ میں ملتی ہے :۔

اذا کان معنی الخلیفۃ من یکون نائبا للّٰہ تعالیٰ فی الحکم والقضاء والاحتیاج الی الحاکم والقاضی انما یکون عند التنازع والتظالم کان الاخبار عن وجود الخلیفۃ اخبارا عن وقوع الفساد والشر بطریق الالتزام۔	جب خلیفہ کے معنے ہیں وہ شخص جو اللہ کا نائب ہو حکومت اور فیصلے میں، اور حاکم و قاضی کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب تنازع اور جور و ظلم موجود ہو تو وجود خلیفہ کی خبر میں التزاماً یہ خبر بھی موجود تھی کہ فساد اور شر واقع ہوگا۔

(تفسیر کبیر، جلد ۱)

اس سے معلوم ہوا کہ اگر نوعِ انسانی کو اختیارات دے کر حکومت اور لوگوں کے درمیان اقامت عدل کے لیے خلافت نہ عطا کی جارہی ہوتی تو فرشتے ہرگز یہ سوال ہی نہ کرتے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ اختیارات دے کر ایک ایسی مخلوق پیدا ہی کیوں کی جائے جو فساد مچائے اور خونریزی کرے۔ ایک ایسی مخلوق کو منصبِ خلافت عطا کیے جانے کی حکمت ان کے فہم سے باہر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو علمِ اسماء عطا کیا اور اس کا مظاہرہ کر کے فرشتوں کو اپنی حکمت سمجھائی اور انسان کو منصبِ خلافت عطا کیے جانے پر مطمئن کیا۔

"خلیفہ" کا لفظ ایک جگہ اور قرآن میں استعمال ہوا ہے اس پر بھی غور کر لینا چاہیے۔

يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ	اے داوٗد! ہم نے تمھیں زمین میں
خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ	اپنا نائب بنایا ہے لٰہذا تم لوگوں میں
بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا	حق و انصاف کے ساتھ حکومت کرو اور
تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ	اپنی خواہش کی پیروی نہ کرو۔ ورنہ وہ
سَبِيلِ اللَّهِ إِنَّ الَّذِينَ	تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔
يَضِلُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ	بے شک اللہ کے راستے سے جو لوگ
لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ	بھٹک جاتے ہیں ان کے لیے سخت
بِمَا نَسُوا يَوْمَ الْحِسَابِ ۝	عذاب ہے۔ اس وجہ سے کہ انہوں نے
(ص : ۲۶)	حساب کے دن کو بھلا دیا۔

معلوم ہوا کہ انہیں خلافت اس لیے دی گئی تھی کہ وہ خدا کے اتارے ہوئے قانونِ عدل کے مطابق حکومت کریں اور مقدمات کا فیصلہ سنائیں

اور اس معاملے میں اپنی خواہش نفس کو ذرہ برابر دخل انداز نہ ہونے دیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو ایک ذراسی لغزش پر تنبیہہ کی گئی تھی، جس کا ذکر اس آیت سے پہلے موجود ہے۔

ان تمام دلائل سے یہ بات بلا اشتباہ ثابت ہوتی ہے کہ زمین میں نوعِ انسانی کی تخلیق اور خدا کے فرمانبردار بندوں کی زندگی کا مقصد خدا کے قانون کی پابندی اور دنیا میں اس کی اقامت اور تنفیذ ہے۔

منصب خلافت کا اہل کون ہے

منشائے تخلیق اور حامل خلافت ہونے کی جہت سے ہر انسان خدا کا خلیفہ ہے، لیکن یہ بات خلافت کی عین حقیقت میں داخل ہے کہ انسان خدا کے دیے ہوئے اختیارات کو اس کی مرضیات کے مطابق استعمال کرے۔ وہ اپنے مالک کے احکام کا خود پابند ہو اور دوسروں کو پابند بنائے۔ ورنہ وہ خلافت کی بلندی سے لڑھک کر بغاوت کے کھڈ میں جا گرے گا۔ مولانا امین احسن اصلاحی خلافت کے تقاضے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

چوتھا یہ کہ عین منصب' خلافت کی فطرت کا تقاضا ہے کہ یہ منصب' صفات کے ساتھ مشروط ہو، غیر مشروط نہ ہو، یعنی منشائے خلقت کے لحاظ سے تو یہ منصب تمام بنی نوع انسان کے لیے عام ہے، ہر انسان خدا کا خلیفہ ہے لیکن اس منصب کی فطرت کا تقاضا ہے کہ اس کے جائز حق دار وہی ہوں جو خدا کی خلافت کے حق کو وفاداری کے ساتھ ادا کریں، جو اس حق کو ادا نہ کریں وہ خدا کے خلیفہ

نہیں، بلکہ اس کے باغی اور غدار ہیں۔

(میثاق، جلد ۲ عدد ۶)

جب مومنین صالحین ہی خلافت الٰہی کے مستحق ہیں تو ان کے منصب کا یہ عین تقاضا ہے کہ وہ دوسرے گرے ہوئے انسانوں کو بغاوت کی پستی سے اٹھا کر خلافت کی بلندی تک پہنچانے کی سعی کریں۔ آج دنیا میں انسانوں کی اکثریت خدا کی بغاوت پر کمر بستہ ہے اور منصبِ خلافت اپنے مستحقین کو آواز پر آواز دے رہا ہے کہ وہ اس بغاوت کو اطاعت سے بدلنے کے لیے کمر بستہ ہو جائیں، ورنہ وہ کارِ خلافت کی انجام دہی میں ناکام ہو جائیں گے۔

نظریہ خلافت پر مبنی ایک نظام کی ضرورت

اوپر کی تفصیل سے یہ بات خود ظاہر ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمانبردار بندوں کو جو خدمت سپرد کی ہے وہ ایک ایسے نظام کی متقاضی ہے جس کی بنیاد نیابتِ الٰہی کے نظریے پر رکھی گئی ہو۔ جب تک ایک ایسا صالح اور طاقتور نظام وجود میں نہیں آجاتا۔ یہ خدمت پوری طرح انجام نہیں دی جا سکتی خدا کی بغاوت اور خواہشِ نفس پر مبنی نظام کی ماتحتی میں کارِ خلافت کی تکمیل ایک ایسا خیال ہے جس کو خیالِ خام ہی کہا جا سکتا ہے۔
مولانا امین احسن اصلاحی تحریر فرماتے ہیں :۔

"پانچواں یہ کہ یہ منصب اپنے مزاج کے لحاظ سے صرف ایک انفرادی منصب نہیں ہے بلکہ ایک اجتماعی اور سیاسی منصب بھی ہے۔ تمام انسانوں کو یا کم از کم ان سارے لوگوں کو جو اس

منصب کی ذمہ داریوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ انفرادی طور پر بھی
اس منصب کے فرائض پورے کرنے ہیں اور اجتماعی طور پر بھی اس کے
مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے ایک نظام قائم کرنا ہے کیونکہ
اس نظام کے بغیر اس کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔

(ماہنامہ میثاق جلد ۲)

ایک شبہے کا جواب اگر کسی کو شبہ ہو کہ جب تفسیر کی کتابوں میں انسان کو اس معنٰے میں بھی خلیفہ کہا گیا ہے کہ یہ اپنی پیش رَو مخلوق جنات کا جانشین ہے تو پھر اس کو خدا کا خلیفہ قرار دینا متیقن کہاں باقی رہتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جنات کی جانشینی کا قول بہت ضعیف ہے اور اس کی کوئی قوی دلیل موجود نہیں ہے۔

قرآن میں متعدد مقامات پر تخلیق آدم کا واقعہ منقول ہے لیکن اس بات کا کہیں اشارہ بھی موجود نہیں ہے کہ ان کو جنوں کی جگہ لینے کے لیے پیدا کیا جا رہا ہے ان مقامات کے ء'' وہ بھی کہیں اس بات کی طرف اشارہ نہیں پایا جاتا کہ اس زمین پر پہلے جنات کی حکمرانی تھی اور ان کو بھگا کر ان کی جگہ پر انسان کو آباد کیا گیا ہے اس قول کی تائید میں کوئی صحیح حدیث بھی نہیں، عقل و درایت کے لحاظ سے بھی یہ قول کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ اس کے برخلاف انسان کے خلیفۃ اللہ ہونے کا قول قوی دلائل سے مدلل ہے اور قرآن میں اس کے واضح اشارات موجود ہیں، بلکہ بقول مولانا امین احسن اصلاحی :۔

''انسان کی حیثیت اس دنیا میں خدا کے خلیفہ اور نائب کی ہے۔

یہ بات قرآن مجید میں نہایت واضح طور پر کہی گئی ہے ۔"

یہی وجہ ہے کہ کسی ایک معتمد مفسرِ قرآن اور عالمِ دین نے بھی اپنی کسی کتاب میں جنات کی جانشینی کے قول کو ترجیح نہیں دی ہے بلکہ عام طور سے مفسرین کرام اور علماءِ دین نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلیفتہ اللہ ہی قرار دیا ہے، اور جہاں تک مجھے علم ہے اب یہ بات علمائے امت کے درمیان تسلیم شدہ ہے۔ اس کی ایک اور مضبوط دلیل یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے لیے ــــ جس کے سربراہ اور کارندے اللہ کی تشریعی قوانین کی تنفیذ میں محض اس کے نائب کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت ہی کا لفظ اختیار فرمایا ہے اور خلافت راشدہ صحیح اور معیاری اسلامی حکومت کے لیے بلند ترین آئیڈیل بن گئی ہے اور یہ ہم سب کو معلوم ہے کہ خلافت راشدہ کا تصور خدا کی نیابتی حکومت کے سوا اور کچھ نہیں ہے ۔ ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لفظ قرآن ہی کے الفاظ کو سامنے رکھ کر استعمال فرمایا ہے ۔ پھر اللہ نے بنی آدم کو اپنی دوسری مخلوقات کے مقابلے میں جو کرامت، عزت اور شرف عطا فرمایا ہے اس کے لحاظ سے دیکھیے جب بھی جنات کی جانشینی کا قول بہت ہی پست محسوس ہوتا ہے۔ حضرت آدم کو اللہ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔ ان کے کالبد میں اپنی روح پھونکی۔ ان کے سامنے فرشتوں کو جھکایا۔ ان کو اپنی صفتِ جلال و جمال کا مظہر بنایا، ان کے لیے تمام کائنات کو مسخر کیا، ان کی ذرّیت میں ہزاروں انبیاء پیدا ہوئے اور انہیں کی ذریت میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وجود بخشا گیا، جو بلا اختلاف خدا کی تمام مخلوقات سے افضل، اکرم، برتر اور اشرف ہیں۔

ایک ایسی مخلوق کو خلیفۃ اللہ کے بجائے خلیفۃ الجن قرار دینا کس قدر ہلکی اور بے وزن معلوم ہوتی ہے۔ ان تمام بینات کے باوجود اگر کوئی شخص انسان کو جنّات کا جانشین سمجھتا ہے تو اس کو اختیار حاصل ہے۔ میں نے اس موضوع پر مستقلاً تفصیل سے لکھنے کی ضرورت اس لیے محسوس نہیں کی کہ میں نے اوپر جو کچھ ثابت کیا ہے اس میں انسان کو جنّات کا جانشین مان لینے سے کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا۔ اگر بالفرض یہ بات مان لی جائے کہ انسان جنات کا جانشین ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس مقصد سے اس زمین پر آباد کیے گئے تھے اور ان کی حیثیت اس زمین میں کیا تھی؛ اور ان کا وہ جرم کیا تھا جس کی پاداش میں فرشتوں کی فوج بھیج کر انہیں منتشر کیا گیا اور ان کی جگہ لینے کے لیے انسانوں کی ایک نئی مخلوق پیدا کی گئی۔ کیا ان پر اللہ نے یہ ذمہ داری عائد نہیں کی تھی کہ وہ زمین میں اس کی مرضی کے مطابق زندگی بسر کریں اور اس کا انتظام اس کی مرضیات کے تحت چلائیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی صاحب عقل اس سوال کا جواب نفی میں نہیں دے سکتا تو پھر انسان کو جنّات کا جانشین قرار دینے سے اصل بات پر کیا اثر پڑے گا اور اس میں کیا فرق واقع ہو جائے گا؟ بس فرق یہ واقع ہو گا کہ پہلے یہ ذمہ داری جنات کے سپرد کی گئی تھی اور اب انسان کے سپرد کر دی گئی ہے۔

سورۂ ذاریات کی ایک آیت

انسان کے منصب خلافت کی اس تفصیل کو سامنے رکھ کر اب ہمیں قرآن کی اس آیت وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ پر غور کر لینا چاہیے کیونکہ

سورۂ ذاریات کی اس آیت کا ایک بہت ہی محدود اور ناقص مفہوم کچھ لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس آیت میں عبادت کے معنے صرف پرستش ہیں اللہ کی پرستش ہی وہ چیز ہے جس کے لیے جن وانس کی تخلیق کی گئی ہے۔ اس غلط خیال نے چونکہ دین اسلام کے مفہوم کو محدود اور ناقص بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس لیے اس پر غور کر لینا بہت ضروری ہے۔

عبادت کے معنی متعیّن کرنے کا صحیح طریقہ

اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ یہاں جو چیز بھی موجود ہے سب اس کی مملوک ہے اور یہ بات بھی قرآنی نصوص سے معلوم ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں اپنے مالک کی عبادت و تسبیح میں مشغول ہیں۔ انسان بھی خدا کا بندہ اور اس کا غلام ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے اپنے اس بااختیار (جو حیوانات وجمادات کی طرح مجبور نہیں ہے) بندے کو کس قسم کی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ انبیاءِ کرام بھی لوگوں کو اللہ کی عبادت ہی کی طرف بلانے کے لیے مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ اس لیے بہت ضروری ہے کہ ہم اس "عبادت" سے واقف ہوں جس کے لیے ہمیں پیدا کیا گیا ہے اسی میں ہماری نجات و فلاح ہے۔ لغت، قرآن اور احادیث میں "عبادت" کے ایک معنی پرستش کے بھی آئے ہیں۔ اس لیے اس آیت میں 'عبادت' کا مفہوم متعین کرنے کے لیے ایک طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے اس کو پرستش کے معنے میں لے لیا جائے اور اپنی زندگی کو مختلف خانوں میں تقسیم کر کے اس کا صرف ایک خانہ اللہ کی پرستش کے لیے کر دیا جائے اور پورے اطمینان کے ساتھ یہ سمجھ لیا جائے کہ ہم نے اپنے

مقصد تخلیق کو پورا کر دیا۔ اور ہم خدا کی رحمتوں، برکتوں، خوشنودیوں اور اس کی جنتوں کے مستحق بن گئے۔ یہ طریقہ آسان تو بہت ہے، لیکن صحیح بالکل نہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ تمام لغوی معانی، قرآن کی متعلقہ آیات، مسئلے سے متعلق احادیث اور شریعت کے تمام واجب التعمیل احکام کو سامنے رکھ کر "عبادت" کا مفہوم متعین کیا جائے، ورنہ ہم اپنے آپ کو ایک بہت بڑے خطرے میں مبتلا کرلیں گے۔ ہمارے عام دینی لٹریچر میں بھی اور جماعت اسلامی کے لٹریچر میں بھی اس اہم موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور قرآن کی آیات سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ ہم سے جس عبادت کا مطالبہ کیا گیا ہے اور جس عبادت کے لیے ہم پیدا کیے گئے ہیں، وہ صرف پرستش نہیں ہے۔ لغت اور قرآن کے نصوص پیش کرکے یہ بتایا گیا ہے کہ عبادت کے معنے صرف پرستش نہیں ہیں۔ میں یہاں ان تمام دلائل کو دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ میں چند دوسرے پہلو ذرا تفصیل سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اگر اس آیت میں عبادت کے معنے صرف پرستش لیے جائیں تو نہ صرف یہ کہ قرآن کی متعدد آیات سے اس کا تصادم ہوگا بلکہ فی الواقع پورے قرآن سے یہ مفہوم ٹکرا جائے گا میں یہاں چند آیات پیش کرتا ہوں۔

سورۂ البقرہ کی آیت ۳۰ تا ۳۹

(۱) اگر صرف سورۂ بقرہ کی ان آیتوں کو سامنے رکھ لیا جائے جن میں انسان کی تخلیق سے متعلق سرگزشت بیان کی گئی ہے اور جس کی تفصیل اوپر کے صفحات میں گزر چکی تو یہ سمجھنا دشوار نہیں ہے کہ سورۂ ذاریات کی اس آیت میں "عبادت"

کو صرف پرستش کے معنے میں لینا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ ورنہ آیتِ خلافت اور آیتِ عبادت میں ناقابلِ حل تضاد اور تناقض پیدا ہو جائے گا۔ یہ بات پہلے مدلّل طور پر لکھی گئی ہے کہ انسان کو دنیا میں اللہ کا خلیفہ بنا کر بھیجا گیا ہے اور یہ بھی واضح کیا جا چکا ہے کہ یہ نیابت' الٰہی کس چیز میں ہے۔ اس لیے انسان کے ذمے' جو 'عبادت' کی گئی ہے وہ صرف پرستش کبھی نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کے ساتھ زندگی کے ہر معاملے میں خواہ اس کا تعلق انفرادی زندگی سے ہو، یا اجتماعی زندگی سے اللہ کی کامل اطاعت بھی ضروری ہے۔ انسان کے ذمے جو عبادت کی گئی ہے وہ پرستش اور اطاعت و بندگی کا مجموعہ ہے صرف پرستش نہیں۔

سورۂ احزاب کی آیت ۷۲

(۲) سورۂ احزاب کے اخیر رکوع آیت ۷۲ میں اللہ نے ذکر فرمایا ہے کہ اس نے آسمانوں' زمین اور پہاڑوں کے سامنے' امانت' پیش کی لیکن ان سب نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور خوف زدہ ہو گئے لیکن انسان نے وہ بارِ امانت اٹھا لیا۔

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید　　　قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

سوال یہ ہے کہ وہ کونسی امانت تھی جسے قبول کرنے سے آسمان' زمین اور پہاڑ تھرا گئے اور انسان نے اسے قبول کر لیا؟ کیا صرف اللہ کی پرستش؟ ظاہر ہے کہ یہ جواب صحیح نہیں۔ اس لیے کہ جہاں تک اللہ کی تسبیح و تقدیس اور اس کی پرستش کا تعلق ہے آسمان، زمین، پہاڑ بلکہ پوری کائنات اس کام میں اپنے یوم پیدائش سے لگی ہوئی ہے اور لگی رہے گی — قرآن کہتا ہے:۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ　　　ہر شے اللہ کی حمد کے ساتھ اس کی

بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ۔ | تسبیح کر رہی ہے لیکن تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ۔

(الحج ۔۱۸)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کو سجدہ کرتے ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں اور سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، درخت جانور اور بہت سے انسان۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يُسَبِّحُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّيْرُ صٰٓفّٰتٍ ؕ كُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَتَسْبِيْحَهٗ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ۝

(النور: ۴۱)۔

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کو یاد کر رہے ہیں وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں اور پرندے پر کھولے ہوئے۔ ہر ایک کو اپنی عبادت اور تسبیح کا طریقہ معلوم ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں اللہ اسے جانتا ہے۔

یہ تین آیتیں بھی یہ جاننے کے لیے کافی ہیں کہ کائنات کی ہر شے اللہ کی پرستش میں مشغول ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ سب کے سب اطاعت گزار اور فرمانبردار بھی ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے:۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا۔ | اور وہ کہتے ہیں کہ اللہ کا کوئی لڑکا ہے

سُبْحَانَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قَانِتُوْنَ ○ (البقرہ: ۱۱۶)

اس کی ذات ان باتوں سے پاک ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ سب کا مالک ہے اور سب اس کے تابعدار ہیں۔

پھر یہ تابع داری و اطاعت گزاری جبر و زور سے نہیں، بلکہ خوشی اور رغبت کے ساتھ ہے۔

ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِىَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ○ (حٰم السجدہ: ۱۱)

پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اس حال میں کہ وہ دھواں تھا۔ اس نے آسمان اور زمین سے کہا۔ بطوع و رغبت آؤ یا بجبر و زور۔ ان دونوں نے کہا۔ ہم رغبت اور خوشی کے ساتھ حاضر ہیں۔

آسمان و زمین، سورج اور چاند، درخت اور پہاڑ، چرند و پرند کو ہم مجبور صرف اس معنے میں کہتے ہیں کہ جو خدمت ان کے ذمے لگائی گئی ہے وہ اس سے سرتابی کی مجال نہیں رکھتے اس معنے میں نہیں کہ جو خدمت و پرستش ان کے ذمے کی گئی ہے وہ اسے بجبر و اکراہ انجام دے رہے ہیں۔ نہیں بلکہ سب کے سب اللہ کے حضور بطوع و رغبت سر بسجود ہیں اور جو خدمت بھی انجام دے رہے ہیں پوری خوشی سے انجام دے رہے ہیں۔

ان آیتوں کو پڑھیے، اور اس کے بعد سورۂ احزاب کی آیت امانت کا مطالعہ کیجیے تو صاف معلوم ہوگا کہ اللہ نے آسمانوں، زمین اور پہاڑوں کے

سامنے جو امانت پیش کی تھی اور جسے قبول کرنے سے انھوں نے انکار کیا وہ ہرگز وہ خدمت اور وہ پرستش نہیں ہوسکتی جسے وہ اپنے یوم پیدائش سے انجام دیتے رہے تھے، بلکہ یہ امانت کوئی اور شے تھی جسے قبول کرنے کے وہ اہل نہ تھے اس تفصیل سے یہ سوال پھر لوٹ آیا ہے کہ وہ امانت کیا تھی جسے قبول کرنے سے انھوں نے انکار کیا اور انسان نے قبول کر لیا۔

اس سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ وہ 'امانت' دنیا میں خدا کی خلافت و نیابت تھی جسے قبول کرنے سے پوری کائنات تھرّا اٹھی۔ ایک ایسا 'عہدۂ تکلیف'، ایک ایسی باشعور و با اختیار ذمہ داری جس کی ٹھیک ٹھیک ذمہ داری پر سلطان کائنات کی خوشنودی اور اس کی لہلہاتی ہوئی جنت کا وعدہ اور جس میں خیانت و نافرمانی کے کرتوت پر اس کے غضب اور بھڑکتی ہوئی جہنّم کی وعید تھی اور یہ بات ظاہر ہے کہ اللہ نے انسان کو صرف اپنی پرستش کا مکلف نہیں قرار دیا ہے بلکہ بہت سے فرائض و واجبات کا مکلّف قرار دیا ہے اس لیے اگر سورۂ ذاریات کی آیت میں عبادت کا مفہوم صرف پرستش لیا جائے تو سورۂ احزاب کی آیت امانت سے ٹکراؤ پیدا ہوگا۔

سورۂ ہود کی آیت سورۂ ہود آیت ۷ میں فرمایا:

"اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ جب کہ اس سے پہلے اس کا عرش پانی پر تھا تاکہ تم کو آزما کر دیکھے کہ تم میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے۔"

یہی مضمون ایک دوسرے انداز میں سورۂ کہف آیت (۷) میں یوں

ادا کیا گیا ہے :۔

"یہ جو کچھ سرو سامان زمین پر ہے اس کو ہم نے زمین کی زینت بنایا ہے تاکہ ان لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون بہتر عمل کرنے والا ہے"۔

سورۂ ملک آیت (۲) میں ارشاد ہوا :۔

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط	جس نے موت اور زندگی پیدا کی، تاکہ تم کو جانچے، تم میں کون اچھا عمل کرتا ہے۔

ان آیتوں نے واضح الفاظ میں بتایا کہ صرف انسان ہی کی تخلیق نہیں، بلکہ یہ سارا ہنگامۂ وجود جس غرض سے برپا کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کے حسنِ عمل کی آزمائش کی جائے ۔یہ دیکھا جائے کہ ان میں کون اچھے عمل کرتا ہے اور کون برے عمل؟ آسمان و زمین کی غایت تخلیق بھی یہی تھی کہ زمین پر انسان کو بسا کر اس کے عمل کی آزمائش کی جائے ۔اب سوال یہ ہے کہ "اچھا عمل" کیا صرف خدا کی پرستش میں محدود ہے؟ کیا قرآن سے معمولی واقفیت رکھنے والا مسلمان بھی اس طرح کی بات کہہ سکتا ہے؟ سورۂ انعام کی آخری آیت میں فرمایا :

وَھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَکُمْ فِیْ مَآ اٰتٰکُمْ۔ (۱۶۵)	وہی ہے جس نے تم کو زمین کا خلیفہ بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض کے مقابلہ میں بلند درجے دیے تاکہ جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔

سوال یہ ہے کہ انسان کو جو کچھ دیا گیا ہے کیا اس کی آزمائش صرف پرستش

سے پوری ہوجاتی ہے ؟ اگر انسانی اعمال کے دائرے میں پرستش کے علاوہ بھی بہت سے اعمال داخل ہیں اور یقیناً داخل ہیں اور اگر انسان کے زیرِ تصرف دنیا میں بہت سی چیزیں دی گئی ہیں جن میں اس کی آزمائش مقصود ہے تو پھر سورۂ ذاریات میں عبادت کے معنے صرف پرستش لینا کسی طرح صحیح ہے ؟ اور اگر یہ مفہوم لیا جائے تو کیا ان آیتوں سے اس کا تصادم نہیں ہوتا ؟ اس طرح کا تضاد تو کسی عاقل انسان کے کلام میں بھی نہیں پایا جانا چاہیے ۔ اللہ رب العٰلمین کے کلام میں کس طرح پایا جائے گا کہیں تو وہ کہہ دے کہ انسان کو ہم نے دنیا میں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے ۔ کہیں کہے کہ ہم نے اس کو ایک ایسی امانت سپرد کی ہے جس کو قبول کرنے سے آسمان، اور پہاڑ بھی لرز اٹھے ۔ کہیں کہے کہ ہم نے یہ سارا ہنگامۂ وجود انسان کے اعمال و تصرفات کی آزمائش کے لیے برپا کیا ہے اور سورۂ ذاریات میں یہ فرمادے کہ ہم نے انسان کو صرف اپنی پرستش کے لیے پیدا کیا ہے ۔ جو لوگ پرستش کے سوا زندگی کے دوسرے معاملات میں اللہ کی اطاعت سے راہ فرار اختیار کرنے کے لیے سورۂ ذاریات کی زیرِ بحث آیت کو استعمال کرتے ہیں ان سے گفتگو نہیں ۔ ہاں جو لوگ واقعی خدا کے فرمانبردار بندے کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں انہیں ضرور غور کرنا چاہیے کہ انھوں نے اس آیت میں عبادت کے معنی صرف پرستش لے کر کس قدر دھوکا کھایا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں جہاں کہیں بھی اللہ نے اپنی عبادت کا مطالبہ کیا ہے اس میں اس کی والہانہ پرستش اور غلامانہ اطاعت دونوں داخل ہیں اور انسانی زندگی کا کوئی شعبہ اس کی عبادت کے دائرے سے خارج نہیں ہے ۔ مسجد میں جا کر نماز پڑھنا بھی عبادت ہے،

اور بازار میں بیٹھ کر صداقت و دیانت کے ساتھ تجارت کرنا بھی عبادت ہی ہے۔

اللہ کی پرستش کس طرح کی جائے

(۴) اگر سورۂ ذاریات کی آیت میں 'عبادت' کے معنے صرف پرستش ہیں اطاعت اس میں داخل نہیں تو سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پرستش کس طرح کی جائے؟ کیا ہر انسان کو اس بات کا اختیار حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے اللہ کی پرستش کرے؟ اگر اختیار حاصل نہیں ہے بلکہ اس میں اللہ کے احکام کی اطاعت ضروری ہے تو پھر ثابت ہو گیا کہ اس آیت میں عبادت کے معنی صرف پرستش نہیں ہیں پرستش اور اطاعت دونوں ہی ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ انسان صرف پرستش میں خدا کی اطاعت کا مکلّف ہے اور دوسرے امور و معاملات میں مکلف نہیں ہے تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوگا کہ اس تفریق کی دلیل کیا ہے؟ کیا اس تفریق کے لیے کوئی عقلی اور شرعی دلیل لانا ممکن ہے؟

صحیح بات یہ ہے کہ جو لوگ عبادت کو صرف پرستش کے معنے میں لیتے ہیں وہ سوچ سمجھ کر یہ بات نہیں کہتے، اس لیے کہ کوئی مخلص مسلمان اس تفریق کا قائل نہیں ہو سکتا کہ اعمال پرستش میں تو انسان خدا کی اطاعت کا مکلّف ہے اور دیگر معاملات میں مکلف نہیں ہے اور نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ پرستش کے سوا انسان کسی اور چیز کا مکلّف نہیں ہے۔

اگر ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھیے تو واقعہ یہ ہے کہ کوئی پرستش بھی اطاعت سے خالی نہیں ہوتی، کبھی اس کی اطاعت ہوتی ہے جس کی پرستش کی جارہی ہے اور کبھی پرستش کسی کی ہوتی ہے اور اطاعت کسی اور کی یہاں تک کہ پتھر کے

بتوں کی پرستش بھی اطاعت سے خالی نہیں ہوتی وہاں یا تو آباء واجداد کی اطاعت ہوتی ہے یا شیطان کی یا اپنے نفس کی۔

اتنی وضاحت کے بعد اس کی ضرورت نہ تھی کہ مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ہ کے بارے میں مفسّرین کرام کی تفسیریں نقل کی جاتیں لیکن مزید توثیق کے طور پر امام رازی کی تفسیر نقل کر رہا ہوں۔ وہ اس آیت کی تفسیر میں ایک سوال قائم کرکے اس کا جواب دے رہے ہیں۔

امام رازیؒ کی تفسیر

ما العبادة التی خلق الجن والانس لها؟ قلنا التعظیم لامر الله والشفقة علیٰ خلق الله فان هذین النوعین لم یخل شرع منهما واما خصوص العبادات والشرائع مختلفة فیها بالوضع والهیئة والقلة والکثرة والزمان والمکان والشرائط و الارکان ولما کان التعظیم

وہ عبادت کیا ہے جس کے لیے جن وانس پیدا کیے گئے ہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ وہ امرِ الٰہی کی تعظیم اور خلقِ خدا پر شفقت ہے اس لیے کہ ان دونوں نوعوں سے کوئی شریعت خالی نہیں رہی ہے۔ ہاں، ان دونوں نوعوں کی عبادات اور جزئی احکام اپنی وضع وہیئت، قلّت وکثرت زمان ومکان اور شرائط وارکان کے لحاظ سے مختلف رہے ہیں اور چونکہ ایسی تعظیم جو اللہ ذوالجلال والاکرام کے لائق ہو صرف عقل سے معلوم نہیں ہو سکتی

الائق بذی الجلال والاکرام لا یعلم عقلا لزم اتباع الشرائع فیہا والاخذ بقول الرسل علیہم السلام فقد انعم اللہ علیٰ عبادہ بارسال الرسل وایضاح السبیل فی نوعی العبادۃ (تفسیر کبیر ج ۷)

اس لیے اس میں شرعی احکام کی پیروی اور قول رسول کی اتباع لازمی ہوئی اس لیے اللہ نے رسول بھیج کر اور عبادت کی ان دونوں نوعوں کے طریقے واضح کر کے اپنے بندوں پر احسان فرمایا ہے۔

اس عبارت سے بھی بصراحت معلوم ہوا کہ سورۂ ذاریات کی اس آیت میں "عبادت" صرف پرستش کے معنے میں نہیں ہے۔ بلکہ اس عبادت کے دائرے میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں داخل ہیں اور انسان عبادت کی ان دونوں قسموں کا مکلف ہے۔ عبادت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور دوسری کا حقوق العباد سے۔ اللہ کا حق ادا کرنا بھی عبادت ہے اور بندوں کا حق ادا کرنا بھی عبادت ہے اور انسان کی تخلیق ان دونوں ہی عبادتوں کے لیے ہوئی ہے۔ امام رازی کی اس تصریح سے بھی یہ بات واضح ہوئی کہ انسان پورے دین اسلام کی پیروی کے لیے پیدا کیا گیا ہے کیونکہ دین اسلام حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں کے مجموعہ کا نام ہے دین کا کوئی حکم بھی لے لیجیے اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہوگا یا حقوق العباد سے، یا دونوں سے۔ اس کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جس کا تعلق نہ اللہ کے حق سے ہو اور نہ بندے کے حق سے۔

اس تفصیل سے پوری طرح یہ بات واضح ہوگئی کہ سورۂ ذاریات کی اس آیت کا غلط مطلب نکال کر جو لوگ صرف نماز روزے، تسبیح و تہلیل اور

اسی طرح کے دوسرے مظاہر پرستش ہی کو عبادت سمجھتے ہیں اور زندگی کے دوسرے معاملات میں اللہ و رسول کے احکام کی اطاعت کو عبادت نہیں سمجھتے وہ سخت دھوکے میں مبتلا ہیں۔ آخرت میں تو جو کچھ ہوگا وہ ہوگا ہی۔ اس دنیا میں بھی اس غلط فہمی نے امتِ مسلمہ کو بہت نقصان پہنچایا ہے اور پہنچا رہی ہے۔

اگر کوئی شخص یا گروہ ان دلائل کو تسلیم نہیں کرتا اور اپنے آپ کو جنات کا خلیفہ سمجھنے اور عبادت کو صرف پرستش میں محدود کرنے پر اصرار کرتا ہے تو اس کو اس کا اختیار رہے۔

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

امّتِ مسلمہ کا نصبُ العین

آیتِ خلافت وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ اور آیتِ عبادت (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ) سے عمومی انداز میں امتِ مسلمہ کا نصب العین اور اس کی حیثیت واضح ہوئی تھی لیکن قرآن نے اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ مخصوص طور پر بھی امت مسلمہ کے منصب کی توضیح کی ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۴۳ پڑھیے:۔

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۴۳

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ: ۱۴۳)	اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔

قرآن کی موجودہ ترتیب کے لحاظ سے یہ سب سے پہلی آیت ہے جو براہ راست امّت مسلمہ کے منصب کی وضاحت کرتی ہے۔ میں یہاں شیخ محمد عبدہٗ اور سید رشید رضا مصری کی تفسیر و تشریح کا حاصل اپنی زبان میں درج کرتا ہوں:۔

وسط، عدل و خیر کو کہتے ہیں وہ اس طرح کہ کسی امر میں شے مطلوب

پر زیادتی افراط ہے اور کمی، تفریط وتقصیر ہے۔ افراط وتفریط میں سے ہر ایک سیدھے اور ٹھیک راستے سے انحراف ہے۔ اسی لیے ان میں ہر ایک، شر ہے اور قابلِ مذمت ہے اور خیر وہ نقطہ اعتدال ہے جو کسی امر کے دونوں کناروں کے درمیان ہوتا ہے۔
یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ اس آیت میں لفظ "وسط" کیوں اختیار کیا گیا جب کہ مقصود اس امت کے خیر امت ہونے کا اعلان کرنا ہے خیر کے صریح لفظ کو چھوڑنے کی وجہ کیا ہے؟ اس سوال کا پہلا جواب یہ ہے کہ لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ میں جو علّت بیان کی گئی ہے۔ یہ لفظ اس کے لیے بطور تمہید اختیار کیا گیا ہے۔ کیونکہ کسی شے کے شاہد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس کا عارف بھی ہو اور عارف وہی ہوگا جو دو کناروں کے درمیان ہو وہ ایک کنارے کو ایک جانب سے دیکھے گا اور دوسرے کو دوسری جانب سے اور جو ایک کنارے پر ہوگا وہ دوسرے کنارے کی حقیقت حال سے ناواقف ہوگا بلکہ وہ وسط کی حقیقتِ حال سے بھی لاعلم ہوگا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ لفظ وسط سے امت مسلمہ کے خیر امت ہونے کا سبب بھی معلوم ہو رہا ہے یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان بہترین امت اس لیے ہیں کہ وہ امت وسط ہیں وہ نہ تو دین میں غلو کرکے افراط اختیار کرتے ہیں اور نہ کمی کرکے تفریط کے مرتکب ہوتے ہیں وہ عقائد، اعمال اور اخلاق سبھی چیزوں میں توسط واعتدال کے مرکز پر مقیم ہیں۔

بات یہ ہے کہ لوگ ظہور اسلام سے قبل دو قسموں میں بٹے ہوئے تھے ایک قسم تو وہ تھی جس پر مادیت چھائی ہوئی تھی اس کے نزدیک جسمانی لذت اندوزیوں کے سوا دوسری کوئی چیز قابلِ لحاظ نہ تھی۔ اس قسم میں یہود و مشرکین داخل تھے۔ دوسری قسم دوسرے کنارے پر تھی وہ دنیا اور دنیا کی تمام جسمانی لذتوں کے ترک ہی کو خالص روحانیت سمجھتی تھی۔ اس قسم میں نصارے صابئین اور ہندوستانی بت پرستوں کے چند گروہ داخل تھے۔ ان دونوں قسموں کے مقابلے میں امت اسلامیہ کے لیے اللہ نے ان کے دین میں روح اور جسم دونوں کے حق کو جمع کر دیا۔ دین اسلام تمام حقوق کا جامع ہے۔ اس لیے کہ انسان جسم بھی ہے اور روح بھی، حیوان بھی ہے اور فرشتہ بھی۔ گویا اس آیت میں اللہ نے امت مسلمہ کو امت وسط بنانے کی خوشخبری اس معنے میں دی ہے کہ یہی امت جسم و روح دونوں کے حقوق کی عارف ہے اور دونوں کے کمال تک ارتقاء کرے گی۔

لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ۔ اس ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے تم کو امتِ وسط بنایا تاکہ تم حق کے گواہ بنو ان لوگوں پر بھی۔ جو محض مادہ پرست اور دینی پہلو سے تفریط و تقصیر کے مرتکب ہیں اور ان لوگوں پر بھی جنہوں نے اپنے آپ کو محض روحانیت کے حوالے کر دیا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ بھی دین میں غلو کرنے والے ہیں۔ تم ان لوگوں کے مقابلے میں بھی گواہی دو گے جو (اِنْ هِيَ اِلَّا

حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیٰ مَا یُھْلِکُنَا اِلَّا الدَّھْرُ) کے قائل ہیں اور تمہاری گواہی یہ ہوگی کہ ایسے لوگ صرف حیوانیت کی طرف مائل ہیں اور انھوں نے اپنی انسانی استعداد کو روحانی فضائل وخصوصیات سے محروم ہو کر ختم کر لیا ہے۔ اور تم ان لوگوں کے مقابلے میں بھی گواہی دو گے جو دین میں غلو کرتے ہیں اور جن کا قول یہ ہے کہ انسان کا جسم روح کا قید خانہ ہے اور اس کے لیے عقوبت وسزا ہے۔ اس سزا سے نجات پانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم تمام جسمانی لذّتوں سے اپنے کو الگ کر لیں، جسم کو سزا دیں اور نفس کو ان چیزوں سے محروم کر دیں جو اللہ نے اس دنیوی زندگی کے لیے مہیا کی ہیں۔ ان لوگوں کے مقابلے میں تمہاری گواہی یہ ہوگی کہ انہوں نے راہِ اعتدال چھوڑ دی ہے اور جسموں اور ان کی زندگی بخش قوتوں کو سزا دے کر انہوں نے اپنی روحوں پر بھی ظلم کیا ہے تم اس گروہ کے خلاف بھی گواہی دو گے اس طرح تم اپنے اعتدال اور تمام امور میں اپنے توسط کی وجہ سے دنیا کی تمام امتوں سے سبقت لے جاؤ گے کیونکہ جس چیز کی تمہیں ہدایت دی گئی ہے وہ انسانی کمال کا وہ درجہ ہے جس کے بعد کوئی کمال نہیں ہے۔ دین اسلام کا ماننے والا ہر حق دار کا حق ادا کرتا ہے۔ وہ اپنے رب کے حقوق، اپنے نفس کے حقوق، اپنے جسم کے حقوق، اپنے قرابت مندوں کے حقوق اور تمام انسانوں کے حقوق ادا کرتا ہے۔

وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ اس ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ رسول علیہ الصلوٰۃ و السّلام ہی مرتبۂ اعتدال و توسط کی کامل ترین مثال ہیں اور آپ ہی کی سیرت و شریعت کی پیروی کر کے یہ امت، امتِ وسط بن سکتی ہے۔ لوگوں میں کس نے آپ کی سنت کی پیروی کی اور کس نے اپنے لیے بدعت کا راستہ اختیار کیا۔ اس مقدمے کے قاضی و حاکم اللہ کے رسول ہی ہیں۔ جس طرح یہ امت اپنے جسمانی و روحانی ارتقاء کے ذریعہ دوسرے لوگوں کے خلاف گواہی دے گی کہ انہوں نے راہِ اعتدال گم کر دی۔ اسی طرح اللہ کے رسول متبع سنت امتیوں کے لیے گواہی دیں گے کہ یہ لوگ ہدایت کی صراط مستقیم پر ثابت قدم رہے۔ گویا اس ٹکڑے میں یہ بات کہی گئی ہے کہ تمہارے لیے اعتدال و توسط کا وصف اسی وقت ثابت و متحقق ہوگا جب تم اپنے عمل کو رسول خدا کی سیرت اور آپ کے اسوۂ حسنہ کے مطابق رکھ کر اس کی محافظت کرو گے اور اگر تم نے اس راہ سے انحراف کیا تو رسولِ خدا اپنی ذات، اور اپنے دین و سیرت کے ساتھ تمہارے خلاف اس کی گواہی دیں گے کہ تم ان کی اس امت میں داخل نہیں ہو جن کی تعریف اللہ نے اپنی کتاب کی اس آیت اور (کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ الخ) کی آیت میں کی ہے بلکہ تم بدعت کی وجہ سے توسط و اعتدال سے خارج ہو جاؤ گے اور کسی ایک کنارے پر جا پڑو گے

جیسا کہ ایک عربی شاعر نے کہا ہے اور زمخشری نے اس آیت کی تفسیر میں اس شعر سے استشہاد بھی کیا ہے

کانت ھی الوسط المحمی فاکتنفت بھا الحوادث حتی اصبحت طرفا

وہ محفوظ وسط تھی پھر حوادث نے اسے گھیر لیا، یہاں تک کہ وہ ایک کنارہ ہوگئی

یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے کہ جب اس آیت میں ایک بڑے عطیہ اور ایک بڑی نعمت کی مہتم بالشان خبر دی گئی ہے تو پھر اس کو تحویل قبلہ کی گفتگو میں ضمناً جملہ معترضہ کے طور پر کیوں لایا گیا اس کو ابتداءً الگ سے یا جہاں اللہ نے اپنی نعمتیں شمار کرائی ہیں اس سیاق میں کیوں نہ لایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کو معلوم تھا کہ تحویل قبلہ کا مسئلہ عنقریب ایک بڑے فتنے کا سبب بننے والا ہے اور عنقریب اہل کتاب یہ کہتے سنے جائیں گے کہ محمد اپنے رب کی طرف سے کسی واضح دلیل پر نہیں ہیں اس لیے کہ انھوں نے اپنا قبلہ بدل دیا اور اگر اللہ نے ان کو بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہوتا تو پھر وہ دوبارہ اس سے منع نہ کرتا اور انہیں اس قبلے سے نہ پھیرتا جو انبیاء علیہم السلام کا قبلہ ہے اور منافقین کہیں گے کہ انہوں نے پہلے بیت المقدس کی سمت اہل کتاب کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے نماز پڑھی پھر ان پر اپنے وطن کی محبت اور اس کی تعظیم غالب آگئی اس لیے وہ پھر کعبے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے لگے لہٰذا وہ اپنے دین کے معاملے میں کسی یقین پر نہیں ہیں بلکہ

مضطرب الخیال ہیں ـــ اس قسم کے شبہے، شبہہ کرنے والوں کو فکری بے اعتدالی کی دلیل ہونے کے باوجود مسلمانوں پر اثر انداز ہونے والے تھے مطمئن اور راسخ الایمان مسلمان، دین میں لوگوں کے شکوک اور دوسروں کو شک میں مبتلا کرنے کی وجہ سے محزون و مغموم ہوتے اور ضعیف وغیر راسخ مسلمان ممکن تھا کہ مضطرب اور متزلزل ہوجاتے، یہ سبب تھا کہ اللہ نے پہلے ہی مسلمانوں کو خبر دے دی کہ تحویل قبلہ کے بعد شکوک اور شک انگیزی کی ایک آندھی اٹھنے والی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس نے ان شکوک و شبہات کے مقابلے کے لیے مسلمانوں کو دلیل و برہان کی تلقین بھی کی اور انہیں یہ بھی بتایا کہ تمام امتوں کے درمیان اُن کا درجہ امتِ وسط کا ہے جو نہ غلو کرتی ہے اور ظاہری سطح پر رک جاتی ہے بلکہ ہر حکم کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے کوشش کرتی ہے اور انہیں یہ بھی بتایا کہ وہ لوگ تمام امور میں اپنے اعتدال اور دین کے حقائق و اسرار کے فہم کی وجہ سے دوسرے تمام انسانوں پر گواہ اور حجت ہیں۔ دینی حقائق میں سے ایک اہم حقیقت یہ ہے کہ جس قبلے کی طرف رخ کر کے وہ نماز پڑھتے ہیں اس کی اہمیت صرف یہ ہے کہ اللہ کی طرف توجہ کے وقت تمام اہل ملت کی جہت اور ہیئت ایک ہو۔

چونکہ تمام جہات کی نسبت اللہ کی طرف ایک ہی ہے کیونکہ وہ

کسی جہت میں بھی محدود و محصور نہیں ہے اس لیے کسی متعین سمت کے التزام میں اللہ و رسول کے حکم کی پیروی ضروری ہے۔ امر خداوندی کے بغیر بطور خود کسی جہت کی تعیین، خواہش نفس کی پیروی اور ایک ایسی تخصیص ہوگی جس کی کوئی دلیل نہ ہو اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جن کو کوئی معتدل المزاج عاقل اپنے لیے پسند نہیں کر سکتا۔ ہاں وہ تحویل قبلہ کی حکمت جاننے کی خواہش کر سکتا ہے۔ اس لیے اللہ نے مسلمانوں کو اس کی حکمتیں بتائیں۔ اس طرح یہ آیت شکوک و شبہات کے گھُپ اندھیرے میں ایک روشن چراغ بن گئی جو مسلمانوں کے آگے آگے چلتا ہے اور افراط و تفریط کے درمیان تذبذب احمقوں کی احمقانہ تنقید کے مقابلے کے لیے حکمت و بصیرت عطا کرتا ہے۔ بخدا یہ قرآن کی ایسی بلند درجہ بلاغت ہے جس سے بلند کسی درجے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

(تفسیر المنار، جلد ۲)

شیخ محمد عبدہٗ اور سید رشید رضا مصری رحمہما اللہ کی یہ تشریح بہتر اور جامع تشریح ہے۔ اس سے بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس آیت میں امتِ مسلمہ کو جو منصب عطا کیا گیا ہے اور قول و عمل، گفتار و کردار دونوں ہی کے لحاظ سے اس کو توسط و اعتدال کے جس مقام کا شاہد بنا کر کھڑا کیا گیا ہے اس کی ذمہ داری کتنی عظیم ہے۔

مولانا ابوالحسن علی ندوی اپنی تازہ کتاب 'مسلم ممالک میں اسلامیت اور

مغربیت کی کش مکش" میں لکھتے ہیں:۔

امتِ اسلامیہ آخری دینی پیغام کی حامل ہے اور یہ پیغام اس کے تمام اعمال اور حرکات و سکنات پر حاوی ہے، اس کا منصب قیادت و رہنمائی اور دنیا کی نگرانی و احتساب کا منصب ہے۔

قرآن مجید نے بہت قوت اور صراحت کے ساتھ اعلان کیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ (آلِ عمران۔ ۱۱)	(اے پیروانِ دعوت ایمانی) تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو لوگوں (کی ارشاد و اصلاح) کے لیے ظہور میں آئی ہے، تم نیکی کا حکم دینے والے، برائی سے روکنے والے اور اللہ پر سچا ایمان رکھنے والے ہو۔

دوسری جگہ کہا گیا ہے:۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ ۱۴۳)	اور اسی طرح تو ہم نے تمہیں 'امت وسط بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو۔

اس لیے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس امت کی جگہ قافلہ کے پیچھے اور حاشیہ برداروں کے صف میں ہو اور وہ دوسری اقوام کے سہارے زندہ رہے اور قیادت و رہنمائی، امر و نہی اور دینی و فکری آزادی کے بجائے تقلید اور نقل، اطاعت و سپر اندازی

پر راضی اور مطمئن ہو۔ (ص ۲۰۲-۲۰۱)

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۴۳ کے بارے میں اس جدید دور کے اُن علماء کی تفسیر وتشریح کو نقل کرنا میں کافی سمجھتا ہوں، اس آیت کے بارے میں تین سوالات سامنے آتے ہیں۔

تین سوالات

(۱) امتِ مسلمہ کو یہ شہادت کہاں دینی ہوگی، دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں جگہ۔

(۲) کیا اس آیت میں عملی شہادت مراد نہیں ہے؟

(۳) کیا شہادت (گواہی) صرف قولی ہوتی ہے؟

اوپر شیخ محمد عبدہٗ، رشید رضا اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کی جو رائیں نقل کی گئی ہیں ان میں تینوں سوالات کے جوابات موجود ہیں۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر سوال کے بارے میں یہاں تھوڑی سی مزید گفتگو کرلی جائے۔

پہلے سوال کا جواب

پہلے سوال پر امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں مفصّل اور مدلّل بحث کی ہے۔ ان کی پوری بحث کو یہاں نقل کرنا موجبِ طوالت ہے اس لیے مختصراً میں وہ اقوال پیش کروں گا جن کا ذکر انھوں نے کیا ہے اور پھر ان کا فیصلہ اور محاکمہ نقل کروں گا

شہادت دنیا اور آخرت دونوں جگہ دینی ہوگی

اس شہادت کے بارے میں اصلاً مفسرین کے صرف دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا تعلق آخرت سے ہے اور دوسرا یہ کہ

دنیا سے ہے۔ امام رازی نے پہلے قول کی دو تفسیریں کی ہیں۔ ایک یہ کہ آخرت میں امت مسلمہ کو یہ گواہی دینی ہوگی کہ تمام انبیاء سابقین نے اپنی امتوں کو خدا کا پیغام پہنچا دیا تھا۔ دوسرا یہ کہ اس امت کو خدا کے نافرمان لوگوں کے ان اعمال کے خلاف گواہی دینی ہوگی جن میں انہوں نے حق کی مخالفت کی تھی۔ اس طرح سب مل کر تین قول بن جاتے ہیں۔ امام رازیؒ کا اپنا خیال یہ ہے کہ اس آیت میں جس شہادت کا ذکر ہے وہ امتِ مسلمہ کو دونوں جگہ دینی ہوگی۔ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تیسرے قول یعنی دنیوی شہادت کی صحت پر دلیل پیش کرنے کے بعد آخر میں اپنا یہ فیصلہ دیا ہے۔

واعلم ان الدلیل الذی ذکرناہ علی صحۃ ھٰذا القول لایبطل القولین الاولین لانابینا بھٰذہ الدلالۃ ان الامۃ ولابد ان یکونوا شھودا فی الدنیا وھٰذا لاینافی کونھم شھودا فی القیامۃ ایضا علی الوجہ الذی وردت الاخبار۔

اور جان لو کہ وہ دلیل جو ہم نے اس قول کی صحت پر دی ہے دو پہلے قولوں کو باطل نہیں کرتی۔ اس لیے کہ ہم نے اس دلیل سے یہ واضح کیا ہے کہ اس امت کا دنیا میں گواہ ہونا ضروری ہے اور یہ اس بات کے منافی نہیں ہے کہ یہ امت قیامت میں بھی گواہ ہو جس طرح حدیثوں میں ذکر کیا گیا ہے۔

(تفسیر کبیر جلد ۲)

اور واقعہ یہی ہے کہ اخروی شہادت اور دنیوی شہادت میں کوئی تضاد

نہیں ہے اس لیے اس کو آخرت کے ساتھ خاص کر دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ بلکہ آخرت میں شہادت کے مقام پر وہی لوگ کھڑے کیے جائیں گے، جنہوں نے دنیا میں خود حق کی شہادت دی ہوگی۔ آگے اس کی تفصیل آرہی ہے۔ پہلے سوال کے تحت یہ مختصر بات یہ بتانے کے لیے پیش کی گئی ہے کہ اس آیت میں دنیوی شہادت کا قول کوئی نیا قول نہیں ہے بلکہ ماقبل رازی سے اب تک مسلسل نقل ہوتا چلا آرہا ہے۔

دوسرے سوال کا جواب

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں قولی شہادت کے ساتھ عملی شہادت بھی مراد ہے بلکہ قیامت میں شہادت علی النّاس کے بلند مقام پر امت مسلمہ کے وہی لوگ کھڑے کیے جائیں گے جنہوں نے دنیا میں سچائی کی قولی و عملی دونوں گواہیاں دی ہوں گی۔

قولی شہادت کے ساتھ عملی شہادت بھی مراد ہے

عن الضحاك | تَكُونُوْا شُهَدَاءَ

فی قولہ لتکونوا شُھَدَآءَ علی النّاس یعنی بذالك الذین استقاموا علی الھدیٰ فھم الذین یکونون شھداء علی الناس لتکذیبھم رسل اللہ وکفرھم بایات اللہ۔ (ابن جریر)

عَلَى النَّاسِ کے قول میں ضحاک کہتے ہیں کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ہدایت پر ثابت قدم رہے تو وہی لوگ وہاں پر لوگوں پر گواہ ہوں گے ان لوگوں پر جنہوں نے اللہ کے رسول کی تکذیب اور اس کی آیتوں کا انکار کیا ہوگا۔

اس عبارت میں ہمیں تینوں باتیں مل جاتی ہیں ۱ یہ بھی کہ شہادت علی الناس میں دنیوی شہادت داخل ہے۔ ۲ یہ بھی کہ اس آیت میں عملی شہادت مراد ہے اور ۳ یہ بھی کہ شہادت قولی کے ساتھ عملی بھی ہوتی ہے کیونکہ استقامت علی الہدیٰ سے بلند عمل کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

قرآن کی دوسری آیت سے استدلال

قرآن کے طالب العلم کو یہ بات معلوم ہے کہ قرآن کے ایک مقام کو سمجھنے کے لیے دوسرے مقامات کی تفسیریں بھی بڑی کارآمد ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں سورۂ نساء کی آیت ۶۹ پڑھیے:۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ	اور جو اللہ و رسول کی اطاعت
فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ	کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا
اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ	جن پر اللہ نے انعام کیا ہے یعنی
وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ	انبیاء صدیقین، شہداء اور صالحین اور
وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا	یہ بڑے اچھے رفیق ہیں۔

اس آیت میں شہداء سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس کا جواب امام رازیؒ کی زبان سے سنیے:۔

فقول الشهيد فعيل بمعنى	ہم کہتے ہیں کہ شہید فعیل کا صیغہ ہے،
الفاعل وهو الذى يشهد	فاعل کے معنے میں اور شہید وہ ہے
بصحة دين الله تارة بالحجة	جو دین اللہ کے حق ہونے کی گواہی
والبيان واخرى بالسيف	دیتا ہے کبھی دلیل و بیان سے اور

والسنان فالشهداء
هم القائمون بالقسط
وهم الذين ذكرهم الله
في قوله شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ
لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ
وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ
ويقال للمقتول في سبيل الله
شهيد من حيث انه بذل
نفسه في نصرة دين الله.
وشهادته له بانه هو الحق
وما سواه هو الباطل واذا
كان من شهداء الله بهذا
المعنى كان من شهداء الله
في الآخرة كما قال وَكَذٰلِكَ
جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا
شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ـ
(تفسیر کبیر جلد ۳ صـ ۲۶۶)

کبھی سیف وسنان سے۔ توشہداء وہ
لوگ ہیں جو عدل و انصاف پر قائم ہیں
اور وہ لوگ ہیں جن کا ذکر اللہ نے اپنے
اس قول میں کیا ہے "اللہ گواہ ہے کہ
اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے" اور اللہ
کے راستے میں قتل ہونے والے کو شہید
اس حیثیت سے کہتے ہیں کہ اس نے اپنی
جان اللہ کے دین کی مدد میں صرف کی۔
اور اس نے گواہی دی کہ وہی حق ہے اور
اس کے سوا ہر دین باطل ہے اور جب
وہ دنیا میں بایں معنے شہداء اللہ میں
تھا تو پھر وہ آخرت میں بھی شہداء اللہ
میں ہوگا۔ جیسا کہ اللہ نے کہا ہے اور
اسی طرح ہم نے تم کو امتِ وسط بنایا تاکہ
تم لوگوں پر گواہ ہو۔

امام رازیؒ نے امتِ مسلمہ کے شہداء کی ایک جامع تشریح کی ہے۔ اس سے چند باتیں بوضاحت معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ آیت البقرۃ کے شہداء علی الناس

اور آیت النساء کے الشہداء میں فرق نہیں ہے۔ دونوں سے ایک ہی گروہ مراد ہے اور اس گروہ میں آیت آلِ عمران کے اولوا العلم بھی داخل ہیں۔ دوسری یہ کہ شہید اس شخص کو کہتے ہیں جو قول و عمل دونوں ہی سے اللہ کے دین کی حقانیت و صداقت کی گواہی دیتا ہے۔ تیسری یہ کہ مقتول فی سبیل اللہ کو بھی شہید اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ دین اللہ کی حمایت میں جان دے کر اس کے حق اور دوسرے ادیان کے باطل ہونے کی عملی شہادت دیتا ہے اور چوتھی یہ کہ آخرت میں شہداء علی الناس کے مقام پر وہی لوگ کھڑے کیے جائیں گے جنہوں نے دنیا میں خود شہادتِ حق کا فریضہ انجام دیا ہوگا۔

سورۂ النساء کی اسی آیت کے تحت سید رشید رضا لکھتے ہیں:۔

واقول ان الشهادة التي تقوم بها حجة اهل الحق على اهل الباطل تكون بالقول والعمل والاخلاق والاحوال فالشهداء هم حجة الله تعالىٰ على المبطلين في الدنيا والآخرة بحسن سيرتهم وتقدم القول في ذالك في تفسير لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ۔
(المنار ج ۵ ص ۲۴۶)

اور میں کہتا ہوں کہ وہ شہادت جس سے اہل حق کی اہل باطل پر حجت قائم ہوتی ہے وہ قول، عمل اور اخلاق و احوال سبھی سے ہوتی ہے پس شہداء باطل پرستوں پر اللہ کی حجت ہیں دنیا و آخرت میں، اپنے حسن سیرت کی وجہ سے۔ اور یہ بات پہلے لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

یہ عبارت اتنی واضح ہے کہ اس پر مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ آیت لِتَكُونُوا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ میں نہ صرف یہ کہ عملی شہادت مراد ہے، بلکہ اس کے بغیر قولی شہادت معتبر نہیں۔ نیز یہ عملی شہادت کا قول کوئی ایسا فلسفہ نہیں ہے جو اب ایجاد کر لیا گیا ہو، اس کے برعکس عملی شہادت کا انکار ایک ایسا قول ہے جو عقل و نقل دونوں کی شہادت سے محروم ہے۔

آیت زیر بحث کے اندر کی دلیلیں

مفسرین کی صراحتوں سے قطعِ نظر خود آیت زیر بحث میں کئی دلیلیں ایسی موجود ہیں جن سے بلا اشتباہ یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ شہادت سے مراد قول و عمل دونوں شہادتیں ہیں۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ امت مسلمہ کو امتِ وسط اس لیے بنایا گیا ہے کہ وہ شہادت علی الناس کا فریضہ انجام دے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صرف قولی شہادت کی بنیاد پر کیا کوئی امت، امتِ وسط بن سکتی ہے؟ اور کیا لفظ وسط میں صرف قول کا توسط و اعتدال مراد ہے۔ ان دونوں سوالوں کا جواب نفی میں ہے یعنی نہ کوئی امت محض قولی شہادت کی وجہ سے امتِ وسط بن سکتی ہے اور نہ لفظ وسط میں صرف قولی توسط و اعتدال مراد لیا جا سکتا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ امت مسلمہ جب تک قولی و عملی دونوں شہادتیں نہ دے، امتِ وسط کے لقب سے ملقب نہیں ہو سکتی۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ اس آیت میں امتِ مسلمہ کو لوگوں پر گواہ قرار دیا گیا ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کو امت مسلمہ پر۔ اس سے واضح طور پر یہ بات نکلتی ہے کہ جس شہادت کے آپ مکلّف تھے اسی شہادت کی امتِ مسلم بھی مکلف ہوگی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر

امتِ مسلمہ کے لیے صرف قولی شہادت فرض تھی؟ اس کا جواب کتاب وسنت سے واقف کوئی شخص اثبات میں نہیں دے سکتا۔ جب آپ کے لیے ضروری تھا کہ اس دین حق کا عملی نمونہ بھی پیش فرمائیں جو آپؐ پر اتارا گیا تھا تو آپ کی نیابت میں امتِ مسلمہ پر بھی ٹھیک وہی فرض عائد ہوتا ہے جو آپؐ پر عائد ہوا تھا۔ تیسری دلیل علیٰ کے صلے میں پوشیدہ ہے۔ لفظ شہید جب علیٰ کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو اس کے معنیٰ "رقیب" کے بھی آتے ہیں اور رقیب کہتے ہیں محافظ و نگراں کو اس کی واضح نظیر سورۂ مائدہ کے آخری رکوع میں موجود ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنا بیان دے رہے ہیں۔

سورۂ المائدہ کی ایک آیت

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا	اور میں ان کا نگراں تھا جب تک
مَا دُمْتُ فِيْهِمْ۔	ان میں موجود رہا۔

اس ٹکڑے کی تفسیر صاحب روح المعانی نے یہ کی ہے:۔

ای رقیبا اراعی احوالھم	یعنی میں ان کا محافظ تھا۔ ان کے
واحملھم علی العمل بموجب	احوال کی نگرانی کرتا اور خود بہ نفسِ
امرك من غیر واسطۃ و	نفیس انہیں تیرے احکام پر عمل کے لیے
مشاھد الاحوالھم من	ابھارتا اور ان کے حالات کا مشاہدہ
ایمان وکفر۔ (روح المعانی)	کرتا، ایمان کی حالت ہو یا کفر کی۔

حراست، حفاظت اور نگرانی کا تعلق عمل سے ہے، قول سے نہیں۔ اس آیت میں شہید کا لفظ علی گواہ کے لیے استعمال ہوا ہے اور اگر صرف

عملی شہادت مراد نہ ہو جب بھی عملی شہادت کا پہلو قولی شہادت سے زیادہ اُبھرا ہوا اور نمایاں ہے۔ مَا دُمْتُ فِیْھِمْ (جب تک میں ان کے درمیان موجود رہا) کے ٹکڑے نے یہ بات بھی صاف کر دی کہ انبیاء کرام علیہم السّلام اس دنیا میں اپنی امت کے لیے قولی و عملی گواہ بنا کر بھیجے جاتے تھے۔ ان کا کام صرف تبلیغ کرنا نہ تھا اور نہ شہادت کے معنی صرف زبانی تبلیغ کے ہیں۔ اگر کوئی شخص عملی شہادت کو اس زمانے کا ایجاد کردہ فلسفہ سمجھتا ہے تو وہ کتاب و سنّت سے واقف نہیں ہے۔

ایک حدیث

بخاری کی کتاب التفسیر میں اس آیت کے تحت ایک حدیث ہے جس میں حضرت ابن عباس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم کے ایک خطبے کا ذکر کیا ہے۔ اس خطبے میں نبی اکرمؐ نے کئی باتیں بیان فرمائی ہیں۔ آخری بات یہ ہے کہ امّت مسلمہ کے کچھ لوگ جب جہنم کی طرف ہنکائے جا رہے ہوں گے تو حضورؐ کو تعجب ہو گا لیکن فرشتے کہیں گے کہ آپ کو یہ معلوم نہیں ہے کہ انھوں نے آپ کی وفات کے بعد دین میں کیا نئی بات پیدا کی تھی اور کس طرح اپنا دین بدل دیا تھا۔ یہ سن کر حضورؐ جو کچھ فرمائیں گے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

فاقول کما قال العبد الصالح وکنت علیھم شھیدا مادمت فیھم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم۔ (بخاری، جلد ۲)	تو میں کہوں گا جس طرح اللہ کے نیک بندے نے کہا اور میں ان پر نگراں تھا جب تک ان کے درمیان رہا پھر جب تو نے مجھے واپس بلا لیا تو ان کا نگراں تو ہی تھا۔

اس حدیث نے واضح کیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم بھی اپنی امّت پر ٹھیک

اسی طرح گواہ رہے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السّلام اپنی امت پر رہے تھے اور یہ پہلے معلوم ہو چکا کہ سورۂ مائدہ کی اس آیت میں شہادت کا عملی پہلو قولی سے زیادہ نمایاں ہے۔

تیسرے سوال کا جواب

دوسرے سوال کے جواب میں جو کچھ لکھا گیا اسی سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ شہادت صرف قولی نہیں ہوتی بلکہ عملی بھی ہوتی ہے اور کَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا کی آیت میں عملی شہادت بھی مراد ہے لیکن بہت سے مسلمات میں بھی شک انگیزی کی رسم عرصۂ دراز سے جاری ہے۔ اس لیے بعض بالکل تسلیم شدہ چیزوں کو بھی از سرِ نو مدلّل کرنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ اسی لیے ایک مستقل سوال کے تحت یہ دکھایا جا رہا ہے کہ شہادت صرف قولی نہیں بلکہ عملی بھی ہوتی ہے۔ پہلے لسان العرب، کا ایک قول یہاں نقل کر رہا ہوں۔

عملی شہادت کی مزید دلیلیں

قال ابن الاعرابی: انشدنی اعرابی فی صفة فرس	ابن الاعرابی نے کہا کہ ایک اعرابی نے ایک گھوڑے کی تعریف میں مجھے یہ مصرع سنایا۔
لہ غائب لم یبتذلہ وشاھد	لہ غائب لم یبتذلہ وشاھد
قال الشاھد من جریہ مایشھد لہ علی سبقہ وجودتہ۔	اس نے کہا گھوڑے کی دوڑ کا شاہد وہ ہے جو اس کی سبقت وجودت پر گواہی دیتا ہے۔

اس مصرع میں گھوڑے کی عمدگی اور اس کی مسابقت پر اس کی رفتار کو گواہ قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ رفتار کی شہادت فعلی و عملی شہادت ہی ہو سکتی ہے۔ معلوم ہوا کہ کلام عرب میں شہادت کا لفظ عملی شہادت کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے فعلی و عملی شہادت کوئی فلسفہ نہیں بلکہ لغوی استعمال ہے۔ بدوی عرب کے کلام کے بعد اب کلام اللہ کی دو(۲) آیتیں ملاحظہ کیجیے :-

(۱) مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسَاجِدَ اللّٰهِ شَاهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ۔ (توبہ ۱۷)	مشرکوں کا کام نہیں کہ اپنے اوپر کفر کی گواہی دیتے ہوئے اللہ کی مسجدیں آباد کریں۔

جب کوئی کافر اپنے کو کافر نہیں کہتا تو پھر کفار قریش کے بارے میں یہ کہنا کس لحاظ سے صحیح ہوگا کہ وہ اپنے کفر کے خود گواہ ہیں۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ شہادت صرف قولی نہیں ہوتی بلکہ عملی بھی ہوتی ہے۔ کفّار کے کافرانہ اعمال و احوال ان کے کفر پر گواہ ہوتے ہیں اور اسی لحاظ سے انہیں اپنے کفر پر گواہ قرار دیا گیا ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں :-

قال ابن عباس شہادتہم علی انفسہم بالکفر سجودھم للاصنام وذالک ان کفار قریش قد نصبوا اصنامہم خارج البیت عند القواعد	ابن عباس رضؓ نے کہا۔ اپنے نفوس پر ان کی شہادت کفر یہ تھی کہ وہ اپنے بتوں کو سجدے کرتے تھے۔ اس طرح کہ کفار قریش نے بیت الحرام سے باہر اس کے گوشوں کے پاس اپنے بت

وکانوا یطوفون بالبیت عراۃ کلما طافوا طوفۃ سجدوا للاصنام فلم یزدادوا بذالک من اللہ الا بعدا (خازن)

نصب کر رکھے تھے اور وہ برہنہ ہو کر کعبہ کا طواف کرتے، جب ایک طواف پورا کرتے تو اپنے ان بتوں کو سجدہ کرتے۔ پس وہ اپنے اس عمل کی وجہ سے خدا سے دور ہی ہوتے چلے گئے۔

فعلی و عملی شہادت کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو گا۔ کعبہ جو توحید کا مرکز اور ایک خدا کا گھر ہے۔ اُس کو بتوں سے سجانا، اس کا عریاں طواف کرنا اور ان بتوں کو سجدے کرنا کفر و شرک پر ایسی عملی شہادت ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے قولی شہادت نہ ہو، جب بھی ان کے خود اپنے کفر پر گواہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ آیت کی تفسیر میں تمام اقوال کو پیش کرنا مقصود نہیں۔ مقصد صرف یہ دکھانا ہے کہ حضرت ابن عباس جیسے اہل زبان اور مفسّرِ قرآن نے کفار قریش کے عمل کو "شہادت" قرار دیا۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں:

شاھدین علیٰ انفسھم بالکفر باظھارھم ما یدل علیہ وان لم یقولوا نحن کفار

انہوں نے کفر کی گواہی دی ایسی باتوں کے اظہار سے جو کفر پر دلالت کرتی ہیں۔ اگرچہ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ ہم کافر ہیں۔

اس عبارت سے بھی معلوم ہوا کہ قولی شہادت نہ ہونے کے باوجود ان کو عملی شہادت کی وجہ سے اپنے کفر پر خود گواہ کہا گیا۔

مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں:۔

الغرض کفار و مشرکین جو اپنے حال و قال سے اپنے کفر و شرک سے گواہی دیتے رہتے ہیں، اس لائق نہیں کہ ان سے مساجد اللہ خصوصًا مسجد حرام کی حقیقی تعمیر (آبادی) ہو سکے۔

(۲) اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۚ وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ۚ (العادیات) بلاشبہ انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے اور وہ خود اس پر گواہ ہے۔

یہاں بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان نے اپنی زبان سے ناشکری کا اقرار کب کیا اور اس نے یہ کب کہا کہ میں اپنے رب کا ناشکرا ہوں۔ اس سوال کا جواب بھی یہ ہے کہ اس نے کفرانِ نعمت کی عملی شہادت دی اور اسی شہادت کی بنا پر اس کو ناشکری پر شہید (گواہ) قرار دیا گیا۔

(وَ اِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ) ای کنودہ (لَشَهِيْدٌ) یشھد علی نفسہ بصنعہ (جلالین)	اور وہ اپنے ناشکرا ہونے پر گواہ ہے وہ اپنے عمل سے اپنے آپ پر اس کی شہادت دیتا ہے۔

مدارک التنزیل میں ہے:

(وَاِنَّهٗ) وان الانسان (علی ذٰلِكَ) علی کنودہ (لَشَهِيْدٌ) یشھد علی نفسہ۔	اور بلاشبہ انسان اپنی ناشکری پر گواہ ہے۔

یشھدُ علیٰ نفسہ کے تحت صاحب اکلیل لکھتے ہیں؛

لیس المراد بشھادۃ الانسان علیٰ نفسہ بالکنود الشھادۃ	انسان کی اپنی آپ پر ناشکری کی شہادت سے مراد قولی شہادت نہیں

بلسان المقال بل المراد الشهادة بلسان الحال۔

بلکہ یہ شہادت بزبان حال ہے

یہی بات صاحب روح المعانی نے لکھی ہے :۔

(لشهيد) لظهور اثره عليه فالشهادة بلسان الحال. الذی هو افصح من لسان المقال۔

وہ گواہ ہے اس سبب سے کہ اس پر ناشکری کا اثر ظاہر ہے تو یہاں مراد زبانِ حال کی شہادت ہے جو زبانِ قال سے زیادہ فصیح ہے۔

اس عبارت سے واضح ہوا کہ عملی و حالی شہادت، قولی شہادت سے زیادہ فصیح ہوتی ہے۔ یعنی عملی شہادت سے انسان کی قلبی کیفیت زیادہ کھل کر سامنے آتی ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے :۔

وان الانسان على كونه كنود الشهيد ای بلسان حاله ای ظاهر ذالك عليه فی اقواله وافعاله كما قال تعالٰی (ما كان للمشركين ان يعمروا مساجد الله شاهدين على انفسهم بالكفر)

اور انسان اپنے ناشکرا ہونے پر گواہ ہے۔ یعنی بزبان حال۔ یعنی اس کا ظاہر اسی پر ہے اس کے اقوال میں اور افعال میں جیسا کہ اللہ نے کہا (مشرکین کا کام نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدیں آباد کریں۔ بایں حال کہ وہ اپنے کفر کے خود گواہ ہیں)

انسان اگرچہ اپنی ناشکری کا زبانی اعتراف نہیں کرتا۔ لیکن اس کے دوسرے اقوال اس کی ناشکری کی دلیل بنتے ہیں۔ اسی طرح اس کے افعال

اس کے ناشکرا ہونے پر گواہ ہوتے ہیں اور اسی جہت سے اس کو اپنی ناشکری پر گواہ قرار دیا گیا ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانی تحریر فرماتے ہیں:۔

"اکثر مفسرین اس جملے کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ انسان خود اپنی ناشکری پر زبان حال سے گواہ ہے۔ ذرا اپنے ضمیر کی آواز کی طرف متوجہ ہو تو سُن لے کہ اندر سے خود اس کا دل کہہ رہا ہے کہ تو بڑا ناشکرا ہے"

شہید کو شہید کیوں کہتے ہیں؟

اللہ کی راہ میں جو شخص قتل کر دیا جاتا ہے اس کو شہید کیوں کہتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان کی ایسی عملی شہادت پیش کرتا ہے جسے سب سے آخری اور بلند درجے کی شہادت کہنا چاہیے کیونکہ جب کسی انسان نے اپنی جان بھی قربان کر دی تو اب اس کے پاس قربان کرنے کی کوئی اور چیز باقی نہیں رہی اوپر سورۂ نساء کی آیت ۶۹ کے تحت امام رازی کی تفسیر میں اس کا ذکر گزر چکا ہے۔ لیکن وہاں یہ چیز ضمناً آئی تھی۔ یہاں ہم خاص اس سوال سے متعلق چند اقوال پیش کرتے ہیں:۔

والشھداء جمع شھید	شہداء، شہید کی جمع ہے اور شہید
وھو المقتول فی سبیل اللہ	وہ ہے جو اللہ کے راستے میں قتل کر دیا
سمی بذالک لقیامہ	گیا ہو۔ اس کا نام شہید اس لیے رکھا
بشھادۃ الحق فی جنب اللہ	گیا کہ وہ اللہ کے معاملے میں شہادت
حتی قتل۔	حق پر قائم رہا یہاں تک کہ قتل
(ابن جریر جلد ۵)	کر دیا گیا۔

ثم الشهداء الذین ادی بهم الحرص علی الطاعۃ والجد فی اظہار الحق حتی بذلوا امھجہم فی اعلاء کلمۃ اللہ سبحانہ (بیضاوی)

پھر شہداء ہیں وہ لوگ جنہیں طاعت کی رغبت اور اظہار حق کی سرگرمی نے اس حد تک پہنچا یا کہ انھوں نے اللہ پاک کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے اپنا خون بہا یا اور اپنی جانیں قربان کر دیں۔

مولانا ابوالکلام لکھتے ہیں:۔

شہید کے معنے گواہی دینے والا یعنی ایسا انسان جو اپنے قول وعمل سے سچائی کا اعلان کرنے والا ہو اور دنیا میں اس کے لیے شہادت و حجت قائم کرے۔" (ترجمان القرآن جلد ا)

ان چند اقوال سے بھی معلوم ہوگیا کہ شہید کو شہید کہنے میں اس کی عملی شہادت کا وزن زیادہ ہے۔ عملی شہادت کے اثبات کے لیے اتنی تفصیل اس لیے پیش کرنی پڑی کہ جو لوگ قرآن و حدیث اور عربی لغت کا براہِ راست علم نہیں رکھتے وہ جان لیں کہ عملی شہادت کوئی فلسفہ نہیں ہے جسے جماعت اسلامی کے کسی شخص نے ایجاد کر لیا ہو، بلکہ اس کا انکار ایک ایسا دعوٰی ہے جسے سن کر حیرت طاری ہوتی ہے۔

شہادت حق کے جس عظیم منصب پر امت مسلمہ سرفراز کی گئی ہے اس کے متعلق دوسری آیت سورۂ حج کے اخیر میں ہے اور جس سیاق و سباق میں ہے اس نے شہادت کے مفہوم کو پوری طرح متعین کر دیا ہے۔ ہم یہاں وہ آیتیں نقل کرتے ہیں۔

سورۃ الحج کی آخری آیت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا	اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ کرو
وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ	اور اپنے رب کی بندگی کرو اور نیکی کرو
وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۚ	شاید کہ تم فلاح پاؤ اور اللہ کی راہ میں جہاد
وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ	کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے اس نے
هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ	تمہیں اپنے کام کے لیے چن لیا ہے اور دین
عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ	میں اس نے تم پر کوئی سخت مشکل نہیں
مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ	ڈالی۔ دین تمہارے باپ ابراہیم کا۔
سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ	اس نے تمہارا نام مسلم رکھا پہلے بھی اور
وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ	اس قرآن میں بھی تاکہ رسول تم پر گواہ
شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا	ہو اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔ پس نماز
شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ۚ فَاَقِيْمُوا	قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ سے
الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا	وابستہ ہو جاؤ وہ تمہارا آقا ہے بہترین
بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى	آقا اور بہترین مددگار۔
وَنِعْمَ النَّصِيْرُ (الحج: ۷۸)	

سورۃ حج کی یہ دو آیتیں اس شہادت کا مفہوم — امت مسلمہ جس کی ذمہ داری قرار دی گئی ہے۔ اس طرح متعین کر دیتی ہیں کہ پوری طرح انشراحِ صدر حاصل ہو جاتا ہے لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ سے پہلے جو کچھ کہا گیا ہے اور اس کے بعد جو کچھ ارشاد ہوا ہے اس کے

درمیان یہ ٹکڑا اس طرح آیا ہے کہ خود پکار کر کہہ رہا ہے کہ امتِ مسلمہ کو شہادت حق کا جو منصب سپرد کیا گیا ہے وہ پورے دین کی اقامت کا فریضہ ہے ، راہ خدا میں جہاد کا فریضہ ہے ۔ ایسا جہاد جس کا حق ادا کر دیا گیا ہو۔ یہی وہ خدمت ہے جس کے لیے یہ امت منتخب کی گئی ہے اور "مسلم" کا معزز لقب اس کو اس لیے عطا کیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے حق کی شہادت پیش کرے ۔ پہلی آیت میں رکوع و سجود، بندگی رب اور عمل خیر کا حکم دیا گیا ہے اور خاص سے عام کی طرف اور عام سے اعم (سب سے زیادہ عام) کی طرف کلام کو اس طرح ترقی دی گئی کہ پورا دین اس کے دائرے میں آگیا۔ اور پورے دین پر عمل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک دین باطل کا زور نہ توڑ دیا جائے اس لیے دوسری آیت کی ابتدا ہی میں جہاد کا حکم دیا گیا ۔ ہمہ جہتی جہاد بہرحال ایک کٹھن چیز ہے ۔ اس لیے چند باتیں ایسی فرمائی گئیں جو بندۂ مومن کے لیے اس کڑوی چیز کو شیریں اور لذیذ بنا دیتی ہیں پہلی بات هُوَ اجْتَبَاكُمْ کے ٹکڑے میں کہی گئی ہے ۔ یعنی کسی اور نے نہیں بلکہ خود تمہارے آقائے ولی نعمت نے تمام نوعِ انسانی میں سے تم لوگوں کو اس خدمت کے لیے منتخب فرمایا ہے ۔ یہ سنتے ہی اطاعت گزار اور آقا سے محبت کرنے والا غلام، مسرت و انبساط کے کیف سے جھوم اٹھتا ہے اور اس کیف میں ہمالیہ کو اپنی جگہ سے ہٹا دینے کی خدمت بھی اسے کٹھن نظر نہیں آتی لیکن مہربان آقا کی طرف سے شفقت بھری ہوئی آواز آتی ہے ۔ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ دین میں اس نے تم پر ایسی مشکل نہیں ڈالی جو "حرج" کی حد تک ہو۔
یہ دوسری بات ہے جس نے راہِ خدا میں جہاد اور فرائض کی تعمیل کو آسان بنایا۔
تیسری بات یہ کہی گئی کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم کا کیش و مذہب اور دین و آئین ہے

ذرا دیکھو تو کہ تمہارے باپ ابراہیم راہِ خدا میں جہاد کے کس درجے پر پہنچے اور حق کے لیے کون سی قربانی ہے جو انہوں نے نہیں دی۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر سعادت مند بیٹوں پر باپ کی وراثت اور ان کی روش کیوں گراں گزرے۔ پھر مزید تاکید کے لیے فرمایا کہ وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہیں مسلم کے معزز لقب سے ملقب کیا ہے تاکہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم لوگوں پر گواہ ہو۔ گویا اس امت کا نام مسلم رکھنے کی غرض یہی شہادت علی الناس ہے۔ اور اس کے بعد فرمایا کہ نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو اور اللہ پر بھروسہ کرو۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ قرآن میں جگہ جگہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کو پورے دین کے اجمالی عنوان کے طور پر بھی استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ فریضہ شہادت حق کی تکمیل اسی وقت ہو سکتی ہے جب پورا دین قائم ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کے حکم کے بعد اعتصام باللہ کا حکم دیا گیا اور بات اس پر ختم کی گئی کہ اللہ ہی تمہارا آقا و مولیٰ ہے۔ یعنی جب تک تمہارا تعلق اللہ سے قوی نہ ہو، تم اس پر بھروسہ نہ کرو، اس سے مدد طلب نہ کرو، اور وہ جب تک تمہاری مدد نہ کرے تم شہادتِ حق اور اقامت دین کا فریضہ انجام نہیں دے سکتے۔

مفسّرین کرام کیا فرماتے ہیں؟

یہ جو کچھ عرض کیا گیا ان آیتوں کی صاف اور سامنے کی تشریح ہے جس کے لیے مقدمات قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب مزید اطمینان کے لیے ان آیتوں کے متعدد ٹکڑوں کی وہ تفسیریں نقل کرتا ہوں جو مفسّرین کرام نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں۔ میں عام طور سے وہی قول نقل کروں گا جسے مفسّرین نے خود اختیار کیا ہے۔

مفسر ابن جریر وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

يقول وذلوا لربكم خضعوا له بالطاعة وافعلوا الخير الذى امركم ربكم بفعله	کہتا ہے کہ اپنے رب کے فرمانبردار ہوجاؤ اور اس کے سامنے اطاعت کے ساتھ جھک جاؤ اور وہ نیکی کرو جس کے کرنے کا حکم تمھارے رب نے دیا ہے۔

تفسیر کبیر میں ہے:۔

اُعْبُدُوْا ربكم فى سائر المامورات والمنهيات	تمام اوامر و نواہی میں اپنے رب کی بندگی کرو۔

وَجَاهِدُوْا حَقَّ جِهَادِهٖ کے تحت مفسر ابن جریر لکھتے ہیں:۔

والصواب من القول فى ذالك قول من قال عنى به الجهاد فى سبيل الله لان المعروف من الجهاد ذالك وهو الاغلب على قول القائل جاهدت فى الله وحق الجهاد هو استفراغ الطاقة فيه۔	اس میں صحیح قول ان لوگوں کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد اللہ کی راہ میں جہاد ہے اس لیے کہ لفظ جہاد کا معروف معنے یہی ہے جب کوئی شخص جَاهَدْتُ فِى اللهِ کا جملہ استعمال کرتا ہے تو اغلباً اس سے مراد راہِ خدا ہی کا جہاد ہوتا ہے اور حق جہاد کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اپنی پوری طاقت صرف کی جائے۔

جلالین میں ہے:۔

(وجاهدوا فی اللہ) لاقامۃ دینہ — یعنی اقامتِ دین کے لیے جدوجہد کرو۔

ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:۔

ای باموالکم والسنتکم وانفسکم — یعنی اپنے مال اپنی زبان اور اپنے جسم وجان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔

امام رازیؒ نے اس سلسلے میں چھ اقوال نقل کیے ہیں اور خود جس بات کو ترجیح دی ہے وہ یہ ہے:۔

والاولیٰ ان یحمل ذالک علیٰ کل التکالیف فکل ما امر بہ ونھی عنہ فالمحافظۃ علیہ جھاد۔ (تفسیر کبیر) — اور بہتر یہ ہے کہ اس کو ہر تکلیف پر محمول کیا جائے۔ پس ہر مامور بہ اور ہر منہی عنہ پر محافظت جہاد ہے۔

صاحب روح المعانی نے پہلے جہاد کی تین قسموں کا ذکر کیا ہے۔ کفار[1] کے ساتھ جہاد، شیطان[2] کے ساتھ جہاد۔ اور نفس[3] کے ساتھ جہاد۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

والاولیٰ ان یکون المراد بہ ضروبہ الثلٰثۃ ولیس ذالک من الجمع بین الحقیقۃ والمجاز فی شیٔ والیٰ ھذا الیشیر ما روی جماعۃ عن الحسن انہ — اور اولیٰ یہ ہے کہ یہاں جہاد سے مراد اس کی تینوں قسمیں ہوں اور اس سے حقیقت ومجاز کو جمع کرنا بالکل لازم نہیں آتا اور اسی طرف اشارہ کرتی ہو وہ روایت جو ایک جماعت نے حسن بصری سے کی ہے کہ انھوں نے یہ آیت پڑھی

قرء الآیۃ وقال ان الرجل لیجاھد فی اللہ وما ضرب بسیف ویشمل ذالک جھاد المبتدعۃ والفسقۃ فانھم اعداء ایضاً ویکون بزجرھم عن الابتداع والفسق۔ (روح المعانی)

اور کہا کہ کوئی شخص راہ خدا میں جہاد کرتا رہتا ہے۔ حالانکہ اس نے ایک بار بھی تلوار نہیں چلائی اور اس جہاد میں بدعتیوں اور فاسقوں سے جہاد بھی شامل ہے اس لیے کہ وہ بھی دین کے دشمن ہیں اور ان سے جہاد یہ ہے کہ ان کو ڈانٹ ڈپٹ کر بدعت اور فسق سے روکا جائے۔

صاحب تفہیم القرآن نے اس کی تفسیر یہ کی ہے:۔

جہاد سے مراد محض قتال (جنگ) نہیں ہے بلکہ یہ لفظ جدوجہد اور کش مکش اور انتہائی سعی و کوشش کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ پھر جہاد اور مجاہدے میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ مزاحمت کرنے والی کچھ طاقتیں ہیں جن کے مقابلے میں جدوجہد مطلوب ہے اور اس کے ساتھ فی اللہ کی یہ قید یہ متعین کر دیتی ہے کہ مزاحمت کرنے والی طاقتیں وہ ہیں جو اللہ کی بندگی اور اس کی رضا جوئی میں اور اس کی راہ چلنے میں مانع ہیں اور جدوجہد کا مقصود یہ ہے کہ ان کی مزاحمت کو شکست دے کر آدمی خود بھی اللہ کی ٹھیک ٹھیک بندگی کرے اور دنیا میں بھی اس کا کلمہ بلند اور کفر والحاد کے کلمے پست کر دینے کے لیے جان لڑا دے۔ اس مجاہدے کا

اوّلین ہدف آدمی کا اپنا نفس امّارہ ہے جو ہر وقت خدا سے بغاوت کرنے کے لیے زور لگا تا رہتا ہے اور آدمی کو ایمان وطاعت کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے جب تک اس کو مسخّر نہ کرلیا جائے باہر کسی مجاہدے کا امکان نہیں۔ (تفہیم القرآن جلد ۳)

هُوَ اجْتَبَاكُمْ کی تفسیر میں ابن جریر نے لکھا ہے :-

یقول هو اختارکم لدینه واصطفاکم لحرب اعدائه والجهاد فی سبیله۔	اللہ فرماتا ہے کہ اس نے اپنے دین کے لیے تمہیں منتخب کیا ہے اور اپنے دشمنوں سے لڑنے اور اپنے راستے میں جہاد کے لیے چن لیا ہے۔

آلوسی لکھتے ہیں :-

(هُوَ اجْتَبَاكُمْ) ای هو جل شانه اختارکم لاغیرہ سبحانه والجملة مستانفة لبیان علة الامر بالجهاد فان المختار انما یختار من یقوم بخدمته ومن قربه العظیم یلزمه دفع اعدائه ومجاهدة نفسه بترك مالا یرضاه ففیها تنبیه علی المقتضیٰ	یعنی اس جلیل الشان نے تمہیں منتخب کیا ہے کسی اور نے نہیں حکم جہاد کی علت بیان کرنے کے لیے یہ مستقل جملہ استعمال ہوا ہے اس لیے کہ صاحب اختیار جسے چاہتا ہے اپنی خدمت کے لیے منتخب کرتا ہے اور اس کی بارگاہ میں تقرب کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ منتخب غلام اپنے آقا کے دشمنوں کو دفع کرے اور اس کی نامرضیات کو ترک کرکے اپنے نفس سے جہاد کرے۔ لہٰذا اس جملہ میں علت جہاد

للجهاد۔ پر تنبیہہ کی گئی ہے۔

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ کے بارے میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ نام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رکھا ہے۔ دوسرا یہ کہ خود اللہ تعالیٰ نے رکھا ہے۔ دوسرے قول کو امام رازیؒ ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

والثانی ان الکنایة راجعة الی اللہ تعالیٰ فروی عن عطاء عن ابن عباس رضی اللہ عنہما انہ قال ان اللہ سماکم المسلمین من قبل ای فی کل الکتب وفی ھذا ای فی القراٰن وھذا الوجہ اقرب لانہ تعالیٰ قال لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ فبین انہ سماھم بذالک لھذا الغرض وھذا لا یلیق الا باللہ۔

اور دوسرا قول یہ ہے کہ ھو کا مرجع اللہ تعالیٰ ہے۔ عطاء ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارا نام مسلم رکھا ہے۔ پہلی تمام کتابوں اور قرآن میں یہ قول زیادہ صحیح ہے اس لیے کہ اللہ نے اس کے بعد کہا تاکہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم لوگوں پر گواہ ہو تو اللہ نے فرمادیا کہ اس نے ان کا یہ نام اسی غرض کے لیے رکھا ہے اور یہ بات صرف خدا کے لائق ہے۔

امام الکلام انہ کیف

باقی رہی یہ بات کہ رسول ہم پر کیسے

یکون الرسول شہید اعلینا وکیف تکون امتہ شہداء علی الناس فقد تقدم فی سورۃ البقرۃ	گواہ ہوں گے اور آپ کی امت لوگوں پر کیسے گواہ ہو گی تو یہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا۔

(تفسیر کبیر ج ۶ ص۲۰۷)

اس عبارت سے تین باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ راجح قول یہ ہے کہ اللہ نے اس امت کا نام مسلم رکھا ہے۔ دوسری یہ کہ مسلم کا لقب اس غرض سے دیا گیا ہے کہ رسول اس امت پر گواہ ہوں اور یہ امت لوگوں پر گواہ ہو تیسری یہ کہ اس آیت میں شہادت کا مفہوم وہی ہے جو سورۂ بقرہ کی آیت میں ہے اور پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ امام رازی کے نزدیک امت مسلمہ کو یہ شہادت دنیا اور آخرت دونوں جگہ دینی ہو گی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ شہادت کے منصب اور اس کے مفہوم کو سمجھنے کے لیے سورۂ حج کی یہ آیتیں کس قدر اہم ہیں۔

سورۂ آل عمران کی دو آیتیں

امت مسلمہ کے مقصد وجود اور اس کے نصب العین کو متعین کرنے والی تیسری اور چوتھی آیتیں یہ ہیں:۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ أُولٰئِكَ	اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونا ضرور ہے کہ (دوسروں کو بھی) خیر کی طرف بلایا کریں اور نیک کام کرنے کو

هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝	کو کہا کریں اور برے کاموں سے روکا
(آل عمران، ۱۰۴)	کریں اور ایسے لوگ (آخرت میں) پورے
	کامیاب ہوں گے۔ (مولانا تھانویؒ)
كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ	(اے امت محمدیہ!) تم لوگ اچھی
لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ	جماعت ہو کہ وہ جماعت (عام) لوگوں
وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ	کے لیے ظاہر کی گئی ہے تم لوگ نیک کاموں
بِاللهِ ؕ	کو بتلاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے
(آل عمران، ۱۱۰)	ہو اور (خود بھی) اللہ پر ایمان لاتے ہو۔
	(مولانا تھانویؒ)

یہ دونوں آیتیں مل کر ایک دوسرے کی توضیح و تکمیل کرتی ہیں اور دوسری آیت میں اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کا ٹکڑا اس بات پر دلیل ہے کہ اس کا تعلق صرف مسلم معاشرے سے نہیں ہے، بلکہ امت مسلمہ کا مقصدِ وجود ہی یہ ہے کہ وہ دنیا کے تمام انسانوں کو معروف کا حکم دے اور انہیں منکر سے روکے۔ اس امت کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے آپ کو درست رکھے، بلکہ اس کا فریضہ یہ بھی ہے کہ ان تمام انسانوں کی صلاح و فلاح کی فکر کرے جو دائرۂ اسلام سے باہر ہیں — علمائے امت ایک طرف تو اس آیت کو امت مسلمہ کے مقصدِ حیات کے ثبوت میں پیش کرتے رہے ہیں اور دوسری طرف اس کے عموم کے قائل رہے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے کسی کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے پورے ٹکڑے کو اپنی نگاہوں سے اوجھل کر دے۔ لیکن اب اس زمانے میں یہ ممکن ہو گیا ہے کہ اس کو حذف

کر کے آیت پر گفتگو کی جائے اور ثابت کر دکھایا جائے کہ اس آیت کا تعلق صرف مسلم معاشرے سے ہے اور اس کو امتِ مسلمہ کے مقصد وجود اور نصب العین کی ترجمانی کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس دعوے کی بنیاد یہ ہے کہ امر و نہی کے معنے کسی کو کسی فعل کا بزور پابند کرنے یا کسی فعل سے بزور روک دینے کے ہیں اور اس کے دائرے میں صرف اعمال ہی نہیں بلکہ عقائد تک داخل ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آیت کا تعلق غیر مسلموں سے نہیں ہو سکتا کیونکہ انہیں بزور ایمان لانے پر مجبور کرنا صحیح نہیں ہے۔

اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کا ٹکڑا

واقعہ یہ ہے کہ اگر اس آیت سے اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کے ٹکڑے کو حذف کر دیا جائے اور امر و نہی کے معانی اور ان کے استعمالات کو نظر انداز کر کے ان الفاظ کو صرف بزور پابند کرنے یا روک دینے کے معنے میں لیا جائے تو پھر یہ آیت پورے مسلم معاشرے تک بھی وسیع نہ ہوگی بلکہ اسلامی حکومت کے صرف امراء و حکام تک محدود ہو کر رہ جائے گی لیکن ظاہر ہے کہ کسی آیت کو سمجھنے اور سمجھانے کا یہ طریقہ بالکل غلط ہے۔

لفظ امر کے معنیٰ

آیت کی توضیح کے سلسلے میں سب سے پہلی بات سمجھ لینے کی یہ ہے کہ بزور و قوت کی بات تو الگ رہی۔ عربی زبان میں امر کا لفظ صرف حکم دینے ہی کے معنے میں نہیں آتا، بلکہ ترغیب، مشورہ، اظہار رائے، دعوت، تعلیم اور نصیحت کے معانی میں بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے اور یہ استعمالات عربی زبان اور قرآن و حدیث کے طالب علم کے لیے اس قدر مشہور ہیں کہ ان پر لغت اور قرآن و حدیث سے دلیلیں پیش کرنے کی بھی ضرورت نہیں

لیکن اس زمانے میں نئے نئے دعوے غیر ضروری کام کرنے پر بھی مجبور کر دیتے ہیں۔ اس لیے محض اختصار سے لفظ امر کے چند استعمالات یہاں دیے جا رہے ہیں:۔

۱۔ لسان العرب میں ہے:۔

لغت کی صراحتیں

و سرب خماص۔ یامرن باقتناص انما اسہا د انھن یشوقن من راھن الیٰ تصیدھا واقتناصھا والافلیس لھن امر	لطیف جسم والی نیل گاؤں کا ریوڑ وہ کہتی ہیں کہ ہمیں شکار کرو۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ وہ نیل گائیں اپنے دیکھنے والوں کو شکار کا شوق دلاتی ہیں، ورنہ فی الواقع ان کا کوئی حکم نہیں ہوتا۔

اس سند سے واضح ہوا کہ شاعر نے اس شعر میں امر کا لفظ تشویق و ترغیب کے لیے استعمال کیا ہے۔

۲۔ مفردات امام راغب میں ہے:۔

قال الشاعرُ امرت نفسی ای امر افعل	شاعر نے کہا، میں نے اپنے نفس سے مشورہ کیا کہ کونسا کام کروں۔

اس مصرع میں شاعر نے امر کا لفظ مشورہ کے معنٰے میں استعمال کیا ہے۔

۳۔ حماسہ میں ہے۔ قال دردید بن الصمۃ

امرتھم امری بمنعرج اللویٰ فلم یستبینوا الرشد الاضحی الغد

علامہ تبریزی نے اس شعر کا معنے یہ بیان کیا ہے:۔

والمعنی ایدیت لھم رایی بمنعرج اللویٰ لیکونوا علیٰ	شعر کا معنے یہ ہے کہ میں نے منعرج اللویٰ (مقام کا نام) میں ان کے سامنے اپنی

حذر فلم يظهر لهم	رائے پیش کر دی تھی تاکہ وہ چوکنا رہیں
رشدی قولی الاحین ھمم	لیکن ان پر میرے قول کی صحت اس
العدو فی الضحیٰ۔	وقت واضح ہوئی جب بوقتِ چاشت
	دشمن ان پر چھا گئے۔

معلوم ہوا کہ درید نے اس شعر میں امر کا لفظ اظہار رائے، مشورہ اور اپنے کہے ہوئے قول کے معنے میں استعمال کیا ہے۔

۴۔ قاموس میں ہے:۔

الامیر:۔ الملك وقائد	امیر، بادشاہ کو کہتے ہیں اور اندھے کے
الاعمٰی والجار والمشاور	رہنما کو اور پڑوسی کو اور اس کو جس سے
	مشورہ کیا جائے۔

ان چاروں پر لفظ امیر کا اطلاق اس بات پر دلیل ہے کہ لفظ امر میں اقتدار رہنمائی، تعاون اور مشورہ کے معانی پائے جاتے ہیں۔

قرآن کے استعمالات

۴۔ سورۂ شعراء میں ہے:۔

قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗۤ اِنَّ	فرعون نے اپنے درباریوں سے جو اس کے
هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ۙ يُّرِيْدُ	اردگرد بیٹھے تھے کہا بلاشبہ یہ کوئی بڑا
اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ	ماہر جادوگر ہے اور چاہتا ہے کہ اپنے
فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ۞ قَالُوْۤا	جادو سے تم کو تمہارے ملک سے نکال
اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَابْعَثْ ۔	باہر کرے تو اب تم لوگ کیا اصلاح دیتے ہو۔

فِی الْمَدَآئِنِ حٰشِرِیْنَ ٥ — انہوں نے کہا موسیٰ اور ان کے بھائی کے معاملے کو چند روز ملتوی رکھیں اور شہروں میں جادوگروں کے جمع کرنے کو ہرکارے روانہ فرمائیں۔ (شعراء ۲۶: ۳۴-۳۶)

کون اس سے ناواقف ہوگا کہ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ میں امر کا لفظ صلاح و مشورہ کے معنے میں مستعمل ہوا ہے۔ اسی طرح اَرْجِهْ اور اِبْعَثْ کے امر کے صیغے حکم دینے کے لیے نہیں بلکہ اظہار رائے اور مشورہ کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔

۶۔ سورۂ طور میں ہے:-

اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (۳۲) — کیا ان کی عقلیں ان کو ان باتوں کی تعلیم کرتی ہیں یا یہ ہے کہ یہ شریر لوگ ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس آیت میں امر کا لفظ سکھانے اور بتانے کے معنے میں آیا ہے۔

(۷) مکے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس طاقت نہ تھی اس کے باوجود آپ لوگوں کو نیکی کی جو باتیں بتلاتے تھے اس کے لیے قرآن نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس کے علاوہ وحی الٰہی نے آپ کو تعلیم معروف کی جو ہدایت کی اس کے لیے بھی امر کا لفظ استعمال کیا۔

وَيَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ (اعراف ۱۵۷) — وہ ان کو نیک باتوں کا حکم فرماتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں۔

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ — عفو و درگزر کی عادت ڈالیے اور نیک کام کی تعلیم کر دیا کیجیے اور جاہلوں

الْجَاهِلِيْنَ ٥ (اعراف، ۱۹۹) سے اعراض کیجیے۔

ان آیتوں سے بھی معلوم ہوا کہ امر و نہی کے الفاظ صرف بزور و قوت پابند کرنے یا روک دینے کے معنے میں نہیں آتے، بلکہ دعوت و تبلیغ، تبشیر و انذار اور تعلیم و ارشاد کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سب سے بڑے معروف کی دعوت دی وہ توحید ہے اور جس سب سے بڑے منکر کے انجام سے ڈرایا وہ شرک ہے۔ حافظ ابن کثیر یَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

ومن اھم ذالک واعظم ما بعثه الله به من الامر بعبادته وحده لا شریک له والنهی من عبادة ما سواه کما ارسل به جمیع الرسل کما قال ولقد بعثنا فی کل امة رسولا ان اعبدوا الله واجتنبوا الطاغوت (تفسیر ابن کثیر)	سب سے اہم اور سب سے بڑا امر بالمعروف وہ ہے جس کے ساتھ اللہ نے آپ کو مبعوث کیا کہ لوگوں کو صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کا حکم دیں اور اس کے ماسوا کی عبادت سے منع کریں جیسا کہ اس نے اسی دعوت کے ساتھ تمام رسولوں کو بھیجا۔ اللہ فرماتا ہے: اور بے شک ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا کہ اے لوگو اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو۔

صاحبِ تفسیر مدارک لکھتے ہیں:۔

بخلع الانداد والتصاف	وہ شرکاء سے ترکِ تعلق اور بندگانِ خدا

العباد وعن عبادۃ	کے ساتھ انصاف کا حکم دیتے ہیں
الاصنام وقطیعۃ	اور بتوں کی پوجا اور قطعِ رحم سے
الارحام (مدارک التنزیل)	منع کرتے ہیں۔

اگر کوئی شخص آپؐ کی یا کسی بھی نبیؑ کی دعوت توحید کو امر بالمعروف کے دائرے سے باہر نکالنے کی بات کہتا ہے تو قطعاً ایک بے دلیل بات کہتا ہے۔

(۸) یٰبُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ	بیٹا! نماز پڑھا کر اور لوگوں کو اچھے
وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَانْہَ	کاموں کی نصیحت کیا کر اور برے
عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلٰی	کاموں سے منع کیا کر اور (اس میں
مَآ اَصَابَكَ	یا کسی اور حالت میں) تجھ پر جو مصیبت
(لقمٰن: ۱۷)	واقع ہو اس پر صبر کیا کر۔

حضرت لقمٰنؑ نے اپنے بیٹے کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتے رہنے کی جو نصیحت کی ہے اس سے کون شخص یہ سمجھ سکتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کو طاقت و قوت کے ذریعے معروف کا حکم دینے اور منکر سے روکنے کا سبق پڑھا رہے ہیں وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ ہے کہ صرف اپنی اصلاح نہ کرو، بلکہ دوسروں کو بھی نیک بننے کی نصیحت کیا کرو اور برائیوں سے انہیں منع کیا کرو اور اس راہ میں جو اذیت اور مصیبت آئے اس پر صبر کرو۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ امر بالمعروف کی اصطلاح نصیحت اور تلقین خیر کے لیے بھی استعمال ہوتی ہے۔

۹۔ نہایۃ میں ہے:۔

دوحدیثیں: وفی الحدیث امیری	اور حدیث میں ہے (حضور نے

من الملٰئكة جبريل اى صاحب امرى ووليى وكل من فزعت الى مشاورته ومو امرته فهو اميرك

فرمایا، فرشتوں میں میرے امیر جبرئیل ہیں یعنی میرے خاص دوست اور صاحب مشورہ۔ اور ہر وہ شخص جس کے مشورے کی تمہیں ناگزیر ضرورت ہو وہ تمہارا امیر ہے۔

۱۰۔ تفسیر المنار میں ہے:۔

وفى حديث جابر ان النبى صلى الله عليه وسلم قال سيد الشهداء حمزة ابن عبد المطلب ثم رجل قام الى امام فامره و نهاه فى ذات الله تعالىٰ فقتله علىٰ ذٰلك (رواه الحاكم والديلمى)

حدیث جابر میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔ شہداء کے سردار حمزہ بن عیدالمطلب ہیں۔ پھر وہ شخص جو کسی حاکم کے پاس گیا اور اس کو اللہ کے معاملہ میں حکم دیا اور منع کیا تو اس نے اس امر و نہی کی پاداش میں قتل کر دیا۔

یہ حدیث بھی اس بات پر نص صریح ہے کہ امر و نہی کے معنے کسی کو حکماً پابند کرنے یا روک دینے ہی کے نہیں ہیں، بلکہ کسی حکمران تک اپنی بات پہنچا دیتے کے بھی ہیں خواہ امر و نہی کرنے والے کی بے بسی و کمزوری اس درجہ کی ہو کہ وہ اس کی پاداش میں قتل کر دیا جائے اور کسی تک کلمۂ حق پہنچا دینے ہی کا نام تبلیغ و ابلاغ ہے۔ آپ انبیاء کرام علیہم السّلام کی تبلیغ کا قرآن میں مطالعہ کریں تو پائیں گے کہ انہوں نے اپنی قوم کو اکثر و بیشتر اوقات حق کی تبلیغ صیغۂ امر ہی سے کی ہے

امر و نہی کے لیے اقتدار ضروری نہیں

لغت اور قرآن وحدیث کے ان چند دلائل سے بھی یہ معلوم ہو گیا کہ امر و نہی کے لیے اقتدار و قوت، نہ لغوی استعمال کے لحاظ سے ضروری ہے اور نہ شرعی اصطلاح کی جہت سے لازمی ہے بلکہ ایک کمزور شہری اپنے اوپر چھائے ہوئے ظالم اقتدار کو بھی امر و نہی کر تا ہے کر سکتا ہے اور کرتا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ قوت نہ ہونے کے باوجود ظالم اقتدار کے سامنے کلمۂ حق ادا کرنا افضل جہاد ہے اور اس کی پاداش میں قتل کیا جانا اعلیٰ درجے کی شہادت۔

اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص امر و نہی کے لیے اقتدار کو ضروری قرار دیتا ہے تو اس کو دھاندلی کے سوا اور کیا کہا جائے گا۔

تفسیر کا ایک اقتباس

مزید اطمینان کے لیے یہاں امام رازی کی تفسیر کا ایک اقتباس دے دینا بھی مفید ہے۔ وہ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۴ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> اس آیت نے تین چیزوں کا مکلف قرار دیا ہے۔ سب سے پہلی چیز دعوت الی الخیر ہے۔ پھر امر بالمعروف، پھر نہی عن المنکر اور عطف کی وجہ سے ضروری ہے کہ یہ تینوں چیزیں ایک دوسرے سے متغائر ہوں۔ پس ہم کہتے ہیں کہ دعوت الی الخیر میں سب سے افضل اللہ کی ذات وصفات کے اثبات اور ممکنات کی مشابہت سے اس کی تنزیہ و تقدیس کی دعوت ہے۔ دعوت الی الخیر کے اس مذکورہ چیز پر مشتمل ہونے کی دلیل اللہ کا یہ قول ہے اُدْعُ اِلیٰ

رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ نیز یہ آیت قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا
اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ۔

اس کے بعد امام رازی نے جو کچھ لکھا ہے وہ ان کے الفاظ میں یہ ہے:۔

اذا عرفت هذا فنقول الدعوة الى الخير جنس تحته نوعان۔ احدهما الترغيب فی فعل ماینبغی وهو الامر بالمعروف والثانی الترغیب فی ترك مالاینبغی وهو النهی عن المنكر فذكر الجنس اولا ثم اتبعه بنوعيه مبالغة فی البيان واما شرائط الامر بالمعروف والنهی عن المنكر فمذكورة فی كتب الكلام۔ (تفسیر کبیر، جلد۳)	جب تم نے یہ جان لیا تو ہم کہتے ہیں کہ دعوت الی الخیر جنس ہے اور اس کے تحت دو نوعیں ہیں ان میں سے ایک کرنے کے لائق فعل کی ترغیب ہے اور وہ امر بالمعروف ہے اور دوسری نہ کرنے کے لائق فعل کو چھوڑ دینے کی ترغیب ہے اور وہ نہی عن المنکر ہے۔ پس اللہ نے پہلے جنس کا ذکر کیا۔ پھر اس کے بعد اس کی دو نوعوں کا ذکر کیا۔ بیان میں مبالغہ کرنے کے لیے۔ باقی رہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی شرطیں تو وہ کتب عقائد میں مذکور ہیں۔

اس عبارت سے دو باتیں بصراحت معلوم ہوئیں ایک یہ کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر دعوت الی الخیر ہی کی ۲ دو نوعیں ہیں اور جاننے والے جانتے ہیں کہ جنس کا اس کی ہر نوع میں پایا جانا ضروری ہے بلکہ اس کا خارجی وجود

انواع کا محتاج ہوتا ہے مجرد جنس کا خارجی وجود ممکن نہیں۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ دعوت الی الخیر یا تو امر بالمعروف کی صورت میں پائی جائے گی یا نہی عن المنکر کی صورت میں۔ اسی بات کو دوسرے مفسرین نے عام وخاص کی اصطلاح میں بیان کیا ہے۔ وہ دعوت الی الخیر کو عام اور ان دونوں کو خاص قرار دیتے ہیں مسئلے کی اس نوعیت کو دیکھیے اور پھر اس جدید دعوے پر غور کیجیے کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر دعوت الی الخیر سے خالی ہے۔

آیت کُنتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ کی مختصر توضیح

اوپر کے دلائل اثبات مدعا کے لیے بالکل کافی ہیں۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ خاص اس آیت کی بھی مختصر توضیح پیش کی جائے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس آیت میں امر و نہی کے الفاظ صرف کسی شخص کو بزور کسی فعل کا پابند کرنے یا اس کے کسی فعل سے روک دینے کے معنے میں لیے جا سکتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان الفاظ کو صرف اس معنے میں محدود کر دینے کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ میں اختصار کے ساتھ ذیل میں اس کے وجوہ عرض کرتا ہوں۔

(۱) اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کا ٹکڑا اس بات پر دلیل ہے کہ امت مسلمہ کے امر و نہی کا سلسلہ اپنے دائرے سے باہر تک دراز ہے، بلکہ یہ آیت بتاتی ہے کہ امت مسلمہ کا مقصد وجود ہی یہ ہے کہ اپنے ساتھ ساتھ وہ دوسرے انسانوں کی بھی اصلاح کرے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کی تفسیر میں خیر امت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وہ کسی خاص قوم و نسب یا مخصوص ملک و اقلیم میں محصور

نہ ہوگی بلکہ اس کا دائرۂ عمل سارے عالم کو اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا گویا اس کا وجود ہی اس لیے ہوگا کہ دوسروں کی خیر خواہی کرے اور جہاں تک ممکن ہو انہیں جنت کے دروازے پر کھڑا کر دے۔ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ میں اسی طرف اشارہ ہے

(حاشیہ بر ترجمہ شیخ الہند)

جلالین کے شارح شیخ سلیمان الجمل لکھتے ہیں:۔

اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ ای لنفعهم و مصالحهم یعنی یہ امت لوگوں کے مصالح و منافع کے لیے ظاہر کی گئی ہے۔

(۲) دائرۂ اسلام سے باہر جو لوگ ہیں ان کی صلاح و فلاح اور ان کے منافع و مصالح کی اساس یہ ہے کہ وہ اسلام قبول کریں اور دائرۂ ایمان و اسلام میں داخل ہو جائیں اور یہ بات ثابت شدہ ہے کہ کسی کو مومن بنانے کے لیے طاقت کا استعمال اور جبر و اکراہ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے ان کو سب سے بڑے معروف، توحید کا حکم دینے اور سب سے بڑے منکر، شرک سے منع کرنے کے معنے یہ ہیں کہ ان کے سامنے قولاً و عملاً ان کی شہادت دے کر ان پر توحید کی خوبیاں اور شرک کی برائیاں واضح کی جائیں۔

(۳) تَاْمُرُوْنَ وَتَنْهَوْنَ کے صیغے پوری امت مسلمہ کے لیے آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ امر و نہی پوری امت مسلمہ کا فریضہ ہے۔ مسلمان، ایک دوسرے کو جو نیکی کا حکم دیں گے اس کا مفہوم وہی ہے جو تواصی بالحق کا ہے۔ جیسا کہ سورۂ والعصر میں کہا گیا ہے۔ ان کو یہ حق نہیں ہے کہ کسی معروف پر عمل کرانے

کے لیے ایک دوسرے پر طاقت کا استعمال کریں۔ یہ حق صرف اُمراء و حکام کو حاصل ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مسلمان بتانے، سکھانے اور ترغیب دینے کے باوجود نماز نہیں پڑھتا تو کسی عام شہری کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کو قید کر دے، یا کوئی اور جسمانی سزا دے کیونکہ اس معاملے میں سزا دینا حکومت کا کام ہے۔

(۴) کسی منکر کے وقوع سے پہلے اس سے منع کرنے کو نہی عن المنکر کہتے ہیں اور جو منکر ابھی سامنے نہیں آیا اس کو روکنے کی اِبتدا طاقت سے کرنا صحیح نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے پر حملہ کر کے اس کو زخمی یا قتل کرنے کا ارادہ کر رہا ہو تو اس کو اس منکر سے روکنے کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے کہ فوراً طاقت استعمال کر دی جائے بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کو نصیحت کی جائے، سمجھایا جائے اور جب وہ نہ سمجھے اور حملے پر تُل ہی جائے تو پھر اس ظالم کا ہاتھ پکڑ لیا جائے اور طاقت استعمال کر کے اس کو اس منکر سے روکا جائے۔ قرآن نے دو لڑنے والے گروہوں میں پہلے صلح کرانے کا حکم دیا ہے اور جب ان میں کا کوئی گروہ اس کو نظر انداز کر کے دوسرے گروہ کے ساتھ زیادتی پر مصر ہو تو پھر اس سے جنگ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ نہی عن المنکر میں بھی شریعت کی تعلیم یہ نہیں ہے کہ ابتدا زور و قوت کے ساتھ کی جائے۔

(۵) عام شہریوں کو بھی بعض مواقع پر طاقت کے استعمال کا جو حق شریعت نے دیا ہے وہ نہی عن المنکر کے لیے نہیں، بلکہ تغییر منکر کے لیے دیا ہے اور ان دونوں میں فرق ہے۔ (اس کی تفصیل آگے آرہی ہے)

(۶) علماءِ حق کا اس مسئلے پر اجماع ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اُمراءِ

حکّام کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ شریعت نے یہ ذمّہ داری ان آحاد مسلمین پر بھی ڈالی ہے۔ جن کے پاس قوت نہیں ہوتی اور مسلمان ہمیشہ یہ کام کرتے اور اس راہ میں سخت سے سخت مصیبت سہتے چلے آرہے ہیں۔

اختصار کے ساتھ جو یہ چند وجوہ عرض کیے گئے ان سے بھی یہ واضح ہوجاتا ہے کہ

(الف) اس آیت میں امر ونہی کے الفاظ کو قوت کے ذریعہ کسی کو کسی فعل کا مکلف کرنے یا کسی فعل سے روکنے کے معنے میں محدود کرنا۔

(ب) اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو صرف مسلم معاشرے کے ساتھ خاص کرنا بالکل غلط ہے

ایک شبہے کا ازالہ

ایک معروف ومشہور حدیث یہ ہے:

مَنْ رَأیٰ مِنْکُمْ منکراً فلیغیرہ	تم میں سے جو شخص کسی منکر کو دیکھے تو
بیدہ فان لم یستطع	وہ اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے
فبلسانہ فان لم یستطع	اور اگر قدرت نہ ہو تو اپنی زبان
فبقلبہ وذالک اضعف	سے اور اس کی بھی قدرت نہ ہو تو
الایمان۔	اپنے دل سے اور یہ سب سے کمزور
(مسلم شریف)	ایمان ہے۔

اس حدیث کو پیش کرکے اگر کوئی شخص یہ شبہہ پیدا کرے کہ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر عمل کے سلسلے میں شریعت کا اولین تقاضا یہ ہے کہ لوگوں کو بزور اس کا پابند کیا جائے تو اس کا جواب کیا ہوگا؟

اس شبہے کا پہلا جواب ہے کہ اس حدیث میں صرف تغییر منکر کے لیے ہاتھ استعمال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس میں کسی معروف کا پابند بنانے کے لیے قوت کے استعمال کی اجازت بالکل نہیں ہے اس لیے استعمال قوت میں امر و نہی دونوں کو یکساں قرار دینا حدیث کا تقاضا نہیں ہے بلکہ شبہہ پیدا کرنے والے کے ذہن کا تقاضا ہے۔ شریعت نے معروف پر عمل کرانے کے لیے عوام میں سے کسی شخص کو بھی عام[1] لوگوں پر طاقت کے استعمال کی اجازت نہیں دی ہے۔ یہ حق اس نے صرف امراء و حکام کو دیا ہے۔ تفسیر المنار میں ہے:

وقال الاستاذ فی الدرس هنا یخلطون بین النهی عن المنکر وتغییر المنکر الذی جاء فی حدیث من رای منکم منکرا فلیغیرہ وهذا شیئ آخر غیر النهی البتة فان النهی عن الشیئ انما یکون	اور استاذ نے درس میں یہاں پر فرمایا: لوگ نہی عن المنکر اور تغییر منکر کو جس کا حکم حدیث مَنْ رای منکم منکرا فلیغیرہ میں آیا ہے خلط ملط کر دیتے ہیں۔ تغییر منکر، نہی عن المنکر سے قطعاً ایک علیحدہ شے ہے اس لیے کہ کسی شے سے نہی اس کے وقوع میں آجانے سے پہلے ہوتی ہے

---

[1] البتہ والدین اپنی اولاد کو نماز کا پابند بنانے کے لیے یا شوہر اپنی بیویوں کو سرکشی سے باز آنے کے لیے جسمانی سزا دے سکتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اہل و عیال عام لوگوں میں داخل نہیں۔ اس کے علاوہ اہل و عیال کو سزا دینا بھی شریعت کا اوّلین تقاضا نہیں ہے بلکہ جسمانی سزا سے پہلے دوسری تدبیریں اختیار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

قبل فعلہ والا کان دفعا للواقع او تحصیلاً للحاصل۔ ورنہ واقع کو غیر واقع ماننا پڑے گا یا اس کو تحصیل حاصل کہیں گے۔

اس بات کو انھوں نے ایک مثال دے کر سمجھایا ہے۔ کہتے ہیں:۔
مثال کے طور پر تم کسی شخص کو دیکھو کہ وہ گھی میں آمیزش کر رہا ہے تو تم پر واجب ہے کہ اس منکر کو بالفعل مٹاؤ اور ہاتھ پکڑ کر اس کو روکو۔ شرط یہ ہے کہ تم کو ایسا کرنے کی قدرت ہو۔ استطاعت کو یہاں نصِ حدیث ہی نے مشروط قرار دیا ہے۔ اور اگر تم کو قدرت نہ ہو تو تم پر زبان سے اس منکر کی تغیر واجب ہے اور یہ زبانی تغییر صرف اس کو زبان سے منع کرنے اور نصیحت کرنے کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ اس میں یہ بات بھی داخل ہے کہ تم اس کا معاملہ حاکم تک پہنچاؤ جو تمھاری قدرت سے بڑھی ہوئی قدرت کے ساتھ اس کو روکے گا باقی رہی دل سے تغییر تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس مرتکب منکر سے نفرت کرو۔ اور اس کے فعل سے راضی نہ ہو اور نہی عن المنکر کے طریقے کثیر اور اس کے اسالیب متعدد ہیں اور ہر مقام کے لیے بات یکساں نہیں ہوتی۔

شیخ محمد عبدہٗ کی اس توضیح سے معلوم ہوا کہ نہی عن المنکر کا موقع کسی منکر کے وقوع میں آجانے سے پہلے تک ہے اور جب کسی منکر کا ارتکاب شروع ہو چکا یا بعض حالات میں اس کی تکمیل ہو چکی ہو تو ایسی صورت میں بشرط قدرت تغییر منکر کا حکم ہے نہ کہ نہی عن المنکر کا اور بعض حالات میں جب کوئی مسلمان کسی منکر کا ارتکاب کر کے

فارغ ہو چکا ہو تو نہ اس منکر سے نہی کا موقع باقی رہتا ہے اور نہ تغییر بالید کا، بلکہ صرف تعزیر باقی رہتی ہے جو حکومت کا حق ہے۔ مثلاً اگر کوئی مسلمان شراب پی کر فارغ ہو چکا ہو تو اب نہ نہی کا موقع ہے اور نہ طاقت کے ذریعہ تغیر کا، بلکہ صرف سزا دی جا سکتی ہے جس کا موقع کسی عامی کو نہیں بلکہ حاکم کو ہے۔ نہی عن المنکر اور تغییرِ منکر کے مواقع الگ الگ ہیں اور دونوں کا حکم بھی الگ الگ ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نہی عن المنکر کے عمل کے لیے طاقت کے استعمال کو شریعت کا اوّلین تقاضا قرار دینا صحیح نہیں اور نہی کی حقیقت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ سورۂ آل عمران کی یہ دونوں آیتیں امتِ مسلمہ کے مقصد وجود اور اسلامی مشن کی بصراحت تعیین کرتی ہیں اور علماء امت ہمیشہ سے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کو امتِ مسلمہ کا اہم ترین فریضہ قرار دیتے آ رہے ہیں۔ جماعت اسلامی نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے، بلکہ اس کے خلاف کہی ہوئی بات ایک نئے دعوے کی حیثیت رکھتی ہے۔

بعض انبیائے بنی اسرائیل کا قتل

اس پوری بحث کے خاتمے پر ایک شبہے کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ شبہہ ہمارے اگلے مفسرین کو بھی پیش آیا تھا۔ شبہہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں سے اس دنیا میں بھی مدد کا وعدہ کیا تھا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت زکریا اور حضرت یحیٰ علیہما السلام کو ان کی قوم نے قتل کر دیا تو پھر یہ وعدۂ الٰہی کس طرح پورا ہوا۔ رسولوں کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے ایمان و عمل اور ان کی جد و جہد میں کوئی کوتاہی رہ گئی تھی، یا یہ کہ انھوں نے حصول مدد کی شرط پوری

نہیں کی تھی جس کی وجہ سے وہ مغلوب و مقتول ہوئے۔ اس لیے ان کے قتل کی توجیہ کیا ہوگی ؟ اس شبہے کے جواب میں مفسرین کرام نے متعدد باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ میں یہاں انہیں نقل کرتا ہوں :۔

حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ مفسر ابن جریر طبری نے یہ سوال اٹھایا ہے اور اس کے دو جواب دیے ہیں۔

(۱) رسولوں سے وعدۂ مدد کی خبر لفظ و صیغہ کے لحاظ سے عام ہے لیکن اس سے مراد خاص ہے اور یہ بات لغتہً جائز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انبیاء و رسل کے ہر ہر فرد سے مدد کا وعدہ نہیں کیا گیا تھا۔

(۲) مدد کے وعدے کا مطلب یہ ہے کہ رسولوں کو ایذا پہنچانے والوں سے اللہ تعالیٰ انتقام لے گا۔ عام ازیں کہ یہ انتقام رسول کی موجودگی میں لیا جائے یا ان کی عدم موجودگی میں یا ان کی موت کے بعد اور یہ معلوم ہے کہ یہودیوں کو قتل انبیاء کی پاداش میں سخت سزائیں دی گئی ہیں اور ان سے انتقام لیا گیا ہے۔ اس لیے وعدۂ الٰہی پورا ہوا۔

امام رازی نے لکھا ہے کہ حق پرستوں کی مدد متعدد طریقوں سے کی جاتی ہے اس کے بعد انھوں نے سات طریقے تحریر کیے ہیں۔

(۱) حجت اور دلیل سے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق کو ثابت کرنے کے لیے جو دلائل و براہین عطا کیے جاتے ہیں وہ ناقابلِ تردید ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے تمام رسولوں اور نبیوں کی مدد کی گئی ہے اور اس لحاظ سے ہمیشہ وہ غالب ہی رہے ہیں

(۲) مدح و ثنا اور تعظیم سے۔ یعنی لوگوں کی زبان پر ان کی مدح و ثنا ہوتی ہے

اور دلوں میں احترام۔ اگر کوئی کسی حق پرست کو قتل بھی کر دے تو وہ لوگوں کے دلوں سے اس کا احترام ختم نہیں کر سکتا۔

(۳) مدد کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انبیاء ورسل اور حق پرستوں کے دل نوریقین سے بھر دیے جاتے ہیں اور وہ ظالموں اور جاہلوں پر اس طرح نظر ڈالتے ہیں جس طرح ملائکہ دنیا کی حقیر ترین شے کو دیکھتے ہیں۔

(۴) باطل پرستوں کا استیلاء اور غلبہ دیر پا نہیں ہوتا یعنی لوگ محسوس کر لیتے ہیں کہ اقتدار پر قبضہ ان کا ناروا ہے۔

(۵) حق پرستوں کو اگر اذیت و مصیبت پہنچے تو اس سے ان کے اجر و ثواب میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۶) ظالم جب مرتے ہیں تو ان کے آثار تک مٹ جاتے ہیں اور حق پرستوں کے آثار ان کی موت کے بعد بھی باقی رہتے ہیں اور لوگ ان کی اقتدا کرتے ہیں۔

(۷) حق پرستوں کی موت کے بعد بھی اللہ تعالیٰ ان کو ایذا پہنچانے والوں سے انتقام لیتا ہے۔

بعض مفسرین نے یہ جواب دیا ہے کہ انبیاء ورسل سے وعدہ بحیثیت مجموعی کیا گیا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ آخر کار فتح رسولوں ہی کی ہوگی اگر درمیان میں کسی نبی کو شکست ہو جائے یا اس کو قتل کر دیا جائے تو اس سے اللہ کے وعدے پر کوئی زد نہیں پڑتی۔

روح المعانی میں حضرت حسن بصریؒ کا قول ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے:

وقال الحسن: المراد النصرة   اور حسن نے کہا۔ مدد اور غلبہ سے مراد

والغلبۃ فی الحرب فانہ	یہ ہے کہ جنگ میں ان کی مدد کی جائے
لم یقتل نبی من الانبیاء	گی اور وہ غالب ہوں گے اس لیے کہ کوئی
فی الحرب وانما قتل من	نبی میدان جنگ میں قتل نہیں کیا گیا
قتل منھم غیلۃ اوعلیٰ	ان میں سے جو بھی قتل ہوا وہ دھوکے
وجہ آخر وان مات نبی	سے یا کسی اور طریقے سے قتل ہوا ہے
قبل النصرۃ اوقتل فقد	اور اگر کوئی نبی مدد سے پہلے وفات
اجری اللہ تعالیٰ ان	پا گئے یا قتل کردیے گئے تو اللہ نے
ینصر قومہ من بعدہ	ان کے بعد ان کی قوم کی مدد کی۔ اس
فیکون فی نصرۃ قومہ	طرح ان کی قوم کی مدد دراصل انہیں

نصرۃ لہ (الجزء الثالث والعشرون)[۱۶۵] کی مدد ہوئی۔

اس زمانے کے بعض اصحابِ علم نے نبی اور رسول کے فرق کو سامنے رکھتے ہوئے کہا ہے کہ فتح اور غلبہ کا وعدہ رسولوں سے کیا گیا ہے، انبیاءؑ سے نہیں۔ اسی لیے کبھی کوئی رسول قتل نہیں کیا گیا، انبیاء ہی قتل کیے گئے ہیں۔

مؤلف کا جواب راقم الحروف کے نزدیک اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ نبیوں اور رسولوں سے ایسی نصرت کا وعدہ جس کے نتیجے میں انہیں غلبہ، فتح، دشمنوں کی ایذا رسانیوں سے نجات اور دنیوی کامیابی حاصل ہو۔ کفار ومشرکین اور اللہ کے کھلے باغیوں کے مقابلہ میں کیا گیا ہے۔ اہلِ کتاب یا بگڑے ہوئے مدعیان اسلام کے مقابلے میں نہیں کیا گیا ہے۔ میں نے گزشتہ صفحات میں اس طرح کی جو آیتیں پیش کی ہیں ان پر

ایک نظر ڈال لینی چاہیے۔ سورۂ ابراہیم آیت ۱۳ تا ۱۵۔ سورۂ الصآفات آیت ۱۷۱ تا ۱۷۳، سورۂ المومن آیت ۵۱، سورۂ المجادلہ آیت ۲۱۔

سورۂ ابراہیم کی آیتیں خاص طور پر قابل مطالعہ ہیں۔ میں یہاں ان آیتوں کے صرف ترجمے نقل کرتا ہوں۔

اور آخر کار منکرین نے اپنے رسولوں سے کہہ دیا کہ ہم تمہیں اپنے ملک سے نکال دیں گے، یا یہ کہ تم ہماری ملّت میں پلٹ آؤ تب ان کے رب نے ان پر وحی بھیجی کہ ہم ان ظالموں کو ہلاک کر دیں گے اور ان کے بعد تمہیں زمین میں آباد کریں گے اور یہ (وعدہ) اس کے لیے ہے جو میرے حضور میں (جواب دہی کے لیے) کھڑے ہونے اور میری وعید سے ڈرے اور انھوں نے فیصلہ چاہا تھا (چنانچہ ان کی دُعا قبول ہوئی) اور ہر جبّار و معاند نے منہ کی کھائی۔

ان آیتوں نے یہ بات بالکل واضح کر دی ہے کہ کافر قوموں کے مقابلے میں ان کے رسولوں سے یہ صریح وعدہ کیا گیا تھا کہ منکرین حق ہلاک کیے جائیں گے اور ان کی ہلاکت کے بعد ان رسولوں کو زمین میں آباد کیا جائے گا۔

چنانچہ حجت پوری کرنے کے بعد جب رسولوں نے فیصلہ چاہا تو اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اس صراحت کے بعد مفسرین کرام کے جوابات تسلّی بخش باقی نہیں رہتے۔ دوسری طرف پورے قرآن میں کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ملتی جس میں انبیاء بنی اسرائیل سے یہ وعدہ کیا گیا ہو کہ انہیں اپنی نافرمان قوم پر غلبہ عطا کیا جائے گا۔ یا یہ کہ اس قوم کے ظالم افراد ہلاک کیے جائیں گے

اور ان انبیاء کو ان سے بچا لیا جائے گا۔

راقم الحروف کے جواب کی دوسری شہادت، واقعات کی شہادت ہے اور وہ یہ ہے کہ جو انبیاء ورسل کفار و مشرکین کی طرف بھیجے گئے ان میں کوئی ایک بھی قتل نہیں کیا گیا بلکہ ان میں سے ہر ایک کو کافروں پر فتح عطا کی گئی ہے اور دشمنانِ خدا کو ہلاک و برباد کیا گیا ہے۔

قتل کے چند واقعات صرف ان انبیاءِ بنی اسرائیل میں ملتے ہیں جو اپنی بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح کے لیے بھیجے گئے تھے اور ان میں سے جن کو قتل کیا خود ان کی قوم نے کیا جو کافر و مشرک نہ تھی بلکہ اپنے وقت کی بگڑی ہوئی مسلم قوم تھی۔ حضرت زکریا اور حضرت یحیٰ علیہما السلام کے قتل کی صراحت قرآن میں نہیں ہے۔ اس میں اجمالی طور پر یہودیوں کے جرائم کی فہرست میں قتل انبیاء کا بھی ذکر کیا گیا ہے ـــــ توریت اور دوسری کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام بنی اسرائیل کے سیدالاحبار اور اپنی قوم کے سب سے بڑے منصب پر فائز تھے اور حکومت بھی کسی کافر کی نہیں بلکہ "اسرائیلی مسلم" ہی کی تھی اور جس حاکم نے ان کو اسرائیلی عبادت گاہ کے سب سے اعلیٰ مقام پر قتل کرایا اس نے ان کی نبوت کا کبھی انکار نہیں کیا۔ یہی صورت حضرت یحیٰ علیہ السلام کے ساتھ پیش آئی۔ جس حکمراں نے ان کو قتل کرایا وہ کوئی کافر نہ تھا اور اس نے اپنی خواہش سے شکست کھا کر جس مقدس انسان کا سر کٹوا کر اپنے دربار کی رقاصہ کے سامنے پیش کیا وہ خود ان کے تقدس کا قائل تھا اور رنج و افسوس کے ساتھ اس نے ان کے قتل کا حکم دیا تھا۔

انبیاء بنی اسرائیل کے قتل کی نوعیت

بات دراصل یہ ہے کہ انبیائے بنی اسرائیل کے قتل کی نوعیت باہمی کشت و خون کی تھی، اس کی حیثیت کسی کافر قوم کے مقابلے میں ان کی شکست اور مغلوبیت کی ہرگز نہ تھی۔ قرآن کی آیات اور واقعات کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ مسلم و کافر کی نزاع اور مسلم و مسلم کی کشمکش کے درمیان فرق کرتی ہے۔ اللہ نے اس کی اجازت کبھی نہیں دی کہ کوئی کافر قوم، اس کے بھیجے ہوئے کسی رسول کو قتل کر سکے۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس دین کی حقانیت پر زد پڑتی، جسے دے کر اس نے رسول کو بھیجا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر رسول پر ایمان لانے والوں کی تعداد کافروں کے مقابلے میں بہت قلیل رہی تو حجت پوری ہونے کے بعد اس نے اپنی قدرت قاہرہ سے کافروں کو ہلاک کر دیا۔ اور اگر رسول پر ایمان لانے والوں کی تعداد اتنی ہوئی کہ وہ میدان جنگ میں مقابلہ کر سکیں تو اس نے میدان جنگ میں ان کی مدد کی اور کافروں نے شکست فاش کھائی۔
بنی اسرائیل کو اگر اللہ کی مشیّت نے یہ چھوٹ دے دی کہ وہ آخری دور کے چند انبیاء کو قتل کر دیں تو اس سے اس دین و شریعت کی حقانیت پر کوئی زد نہیں پڑتی جس کے احیاء کی وہ سعی کر رہے تھے بلکہ ان کے خون نے شجر دین کی خشک جڑوں میں نئی تازگی پیدا کر دی۔

انبیاء بنی اسرائیل اور ان کی قوم کے نافرمان افراد کے درمیان جھگڑے کی وہی نوعیت تھی جو امت مسلمہ کے سرکش حکمرانوں اور مجاہد صلحاء و علماء کے درمیان ہے۔ اس امت کے بارے میں اللہ نے اپنے آخری رسول ؐ کی یہ دعا تو

قبول کرلی کہ اس پر وہ کسی ایسے مسلم دشمن کو مسلط نہیں کرے گا جو اس کا استیصال کر دے لیکن یہ دعا قبول نہیں کی کہ ان کے درمیان باہمی کشت وخون نہ ہو۔ یہ ایک دوسرے کو قتل نہ کریں اور جیلوں اور قید خانوں میں نہ ڈالیں۔ جس حدیث میں اس دعا کا ذکر ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:۔

عن عبد الله بن خباب ابن الارت عن ابيه قال صلّى رسول الله صلّى الله عليه وسلّم صلوٰة فاطالها فقالوا يا رسول الله صليت صلوٰة لم تكن تصليها قال اجل انها صلوٰة رغبة ورهبة انى سالت الله فيها ثلاثا فاعطانى اثنتين ومنعنى واحدة سالته ان لا يهلك امتى بسنة فاعطانيها وسالته ان لا يسلط عليهم عدوا من غيرهم فاعطانيها وسالته ان لا يذيق بعضهم باس بعض

عبداللہ اپنے والد خباب بن الارت سے روایت کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک طویل نماز پڑھی تو صحابہ نے کہا یا رسول اللہ! آپ نے ایک ایسی نماز پڑھی جو (عادتاً) نہیں پڑھتے تھے آپ نے فرمایا۔ ہاں، یہ امید اور خوف کی نماز تھی۔ اس میں میں نے اللہ سے تین چیزیں مانگیں۔ اس نے مجھے دو چیزیں عطا کیں اور ایک چیز عطا نہیں کی۔ میں نے سوال کیا کہ وہ میری امت کو قحط عام سے ہلاک نہ کرے۔ اللہ نے یہ دعا قبول کرلی اور میں نے اس سے سوال کیا کہ وہ ان پر کفار میں سے کسی دشمن کو مسلط نہ کرے۔ اللہ نے یہ دعا بھی قبول کرلی

فمنعنیها۔
(هذا حدیث حسن صحیح
ترمذی ابواب الفتن ج ۲۔)

اور میں نے سوال کیا کہ ان میں سے بعض لوگ دوسرے بعض لوگوں کو جنگ کا مزا نہ چکھائیں تو اللہ نے یہ دعا قبول نہ کی۔

اس مضمون کی حدیث ابن ماجہ نے کتاب الفتن میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے اور امام مسلم نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے حضرت ثوبان کی روایت زیادہ واضح ہے۔ میں اس کا ترجمہ یہاں نقل کرتا ہوں۔

حضرت ثوبان کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں نے اپنی امّت کے بارے میں دعا کی کہ وہ اس کو قحط عام سے ہلاک نہ کرے اور نہ اس پر باہر کے کسی ایسے دشمن کو مسلّط کرے کہ جو اس کا استیصال کر دے اور میرے رب نے کہا اے محمد! جب میں کوئی فیصلہ کر دیتا ہوں تو کوئی اسے ردّ نہیں کر سکتا اور میں نے تمہاری امت کے لیے تمہیں یہ عطا کر دیا کہ میں اس کو قحط عام سے ہلاک نہیں کرونگا اور نہ اس پر اس سے باہر کے کسی ایسے دشمن کو مسلط کروں گا جو اس کا استیصال کر سکے۔ اگرچہ کرۂ ارض کے تمام دشمن اسے مٹانے کے لیے سمٹ آئیں تا آنکہ خود اس امّت کے لوگ آپس میں ایک دوسرے کو ہلاک کریں۔ اور ایک دوسرے کو قید کریں۔"

(مسلم شریف جلد ۲، کتاب الفتن)

ان حدیثوں سے یہ بات واضح ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے امّت مسلمہ کے باہمی

نزاع میں اہل حق کی حفاظتِ جان کا وعدہ نہیں کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس امت کے گمراہ اور نافرمان افراد نے بھی سیکڑوں علمائے حق کو قتل کیا ہے اور اس کا سلسلہ جاری ہے۔ ٹھیک یہی معاملہ ان انبیاءِ بنی اسرائیل کے ساتھ پیش آیا تھا جنہیں ان کی قوم کے گمراہ افراد نے قتل کر دیا۔

میرے جواب کی صحت پر تیسری شہادت یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے سب سے آخری رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قتل پر ان کی قوم قادر نہیں ہو سکی۔ اس کی دو وجہیں تھیں ایک یہ کہ اس قوم کی اکثریت نے کھلّم کھلّا ان کی نبوت و رسالت کا انکار کر دیا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس وقت یہ قوم کافر رومیوں کی براہِ راست غلامی میں زندگی بسر کر رہی تھی اور اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے قتل کا فیصلہ رومیوں کی عدالت سے حاصل کیا تھا۔ اس طرح اب مقابلہ اللہ کے رسول اور منکرین حق کے درمیان تھا۔ جب صورت یہ پیش آئی تو ہم یہاں بھی دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ پر وحی بھیجی کہ ہم تمہیں ان منکرین سے بچا لیں گے اور تمہاری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک ان لوگوں پر فوقیت برتری اور سربلندی عطا کریں گے جنہوں نے تمہارا انکار کر دیا ہے۔

اس تفصیل سے پوری طرح یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انبیاء و رسل کی حفاظت جان کا وعدہ الٰہی منکرین حق کے مقابلے میں تھا اور جب بھی ایسی صورت پیش آئی خدا کا یہ وعدہ پورا ہوا۔

ایک اور سوال

اگر شہادت اور اقامت دین کے مفہوم میں اللہ کے اتارے ہوئے قانون حیات کی تنفیذ و ترویج اور اسی کے مطابق

ریاست کی تشکیل داخل ہے تو پھر اس کے معنے یہ ہیں کہ بہت سے انبیاء کرام نے نہ اقامت دین کا کام انجام دیا اور نہ مکمل طور پر حق کی شہادت ہی دی اس لیے کہ وہ نہ کسی اسلامی ریاست کی تشکیل کر سکے اور نہ کوئی حکومت قائم کر سکے۔ مثال کے طور پر حضرت نوح علیہ السّلام کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ کوئی حکومت قائم نہیں کر سکے تھے تو کیا ان کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ (نعوذ باللہ) ان کی شہادت حق ناقص تھی۔

حضرت نوح ؑ نے اسلامی حکومت قائم کی تھی

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السّلام نے اسلامی حکومت قائم کی تھی، وہ خود اس کے سربراہ تھے اور اس میں وہی قانون نافذ تھا جو ان پر اللہ تعالیٰ نے اتارا تھا۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ وہ کوئی اسلامی حکومت قائم نہیں کر سکے۔ اوپر کے مباحث میں میں نے قرآن کریم کی صریح آیتوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ اپنے رسول اس لیے بھیجتا رہا ہے کہ دین شرک مغلوب اور دینِ توحید غالب ہو۔ ایک ایسی آزاد فضا اور ایک ایسا پاکیزہ ماحول مہیا ہو جس میں دین حق کی مکمل پیروی کی جا سکے اور اس پیروی میں کوئی طاقت مزاحم نہ ہو۔ اس نے اپنے رسولوں کو کفار و مشرکین کے مقابلے میں جب بھی بھیجا ہے اپنی مدد کا وعدہ کر کے بھیجا ہے اور اس وعدے کے ایفاء میں کبھی تخلف نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہ وعدہ کبھی اس شکل میں پورا ہوا ہے کہ اس نے اپنی قدرت قاہرہ سے باغیوں کا استیصال کر کے اپنے فرمانبردار بندوں کو ہر مزاحمت سے آزاد کیا ہے اور کبھی اس صورت میں پورا ہوا ہے کہ

اپنے فرمانبرداروں کے لشکر کو باغیوں کی فوج پر فتح عطا کر کے کفر و شرک کی طاقت کو شکست دی ہے اور ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ اپنے رسول کو منکرین حق کے درمیان سے صحیح و سلامت نکال لے گیا ہے اور پھر ان کی پیروی کرنے والوں کو ان کے منکرین پر غلبہ عطا کیا ہے۔ یہ بات بھی بدلائل ثابت کی جاچکی ہے کہ حق پرستوں کو غلبہ اس لیے عطا کیا جاتا ہے کہ خدا کا بھیجا ہوا دین خودساختہ ادیان پر غالب اور خدا کا نازل کیا ہوا قانون حیات نافذ اور رائج ہو۔

حضرت نوح علیہ السّلام ساڑھے نوسو برس تک اپنی قوم کو اللہ کا پیغام پہنچاتے رہے، کش مکش کرتے رہے اور اذیتیں سہتے رہے۔ لیکن ان کی سرکش قوم ایمان نہ لائی اور بغاوت پر اڑی رہی۔ آخرکار اللہ کا وعدہ طوفان نوح کی شکل میں نمودار ہوا اور پوری قوم کو بہا لے گیا۔ حضرت نوح اور ان پر ایمان لانے والوں کی کشتی موجوں کے سینے پر سوار، رواں دواں رہی۔ یہاں تک کہ طوفان کم ہوا اور وہ کوہ جودی پر جا لگی اور پھر کوہ جودی کے دامن میں وہ ریاست تشکیل پائی جس کے سربراہ خود حضرت نوح علیہ السّلام تھے۔ ان کی زندگی میں اور ان کے بعد معلوم نہیں کب تک اس مملکت کا آئین وہ شریعت تھی جو حضرت نوح علیہ السّلام پر نازل ہوئی تھی۔ تمام انفرادی و اجتماعی معاملات اسی شریعت کے مطابق انجام پاتے تھے، پھر یہ کہنا اور سمجھنا کہ حضرت نوحؑ کوئی اسلامی ریاست تشکیل نہ دے سکے۔ کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔ حضرت نوحؑ کی پوری تاریخ محفوظ ہوتی تو ہم ان کی حکومت کے تمام انتظامات کی اسی طرح نشاندہی کر سکتے جس طرح مدنی ریاست کے انتظامات کی کرتے ہیں۔

اسلامی حکومت کے معنے اس کے سوا اور کچھ نہیں ہیں کہ اللہ کے تمام احکام پر عمل کرنے کی کامل آزادی حاصل ہو اور اگر کہیں مزاحمت موجود ہو تو وہ ختم ہو چکی ہو۔ اس حکومت کے لیے نہ کسی خاص رقبے کی شرط ہے اور نہ باشندوں کی کسی خاص تعداد کی۔ اگر زمین کے کسی حصہ میں مسلمانوں کا کوئی مختصر خاندان بھی موجود ہے اور وہ اللہ کے ہر حکم پر عمل کر رہا ہے، چاہے اس کا تعلق نماز سے ہو، یا چور کا ہاتھ کاٹنے سے اور دوسری کوئی طاقت نہیں جو اس کا ہاتھ پکڑ رہی ہو تو زمین کا وہ ٹکڑا اسلامی حکومت اور اس خاندان کا نگراں اس کا سربراہ ہے۔

حضرت آدمؑ دنیا کے سب سے پہلے حکمراں بھی تھے

ہم سب جانتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے اپنا نائب بنا کر بھیجا تھا اور وہ نیابت یہ تھی کہ وہ اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایات پر خود عمل کریں اور دوسروں سے عمل کرائیں۔ کیا اس نیابت کے دائرے سے حکومت خارج ہے؟ یقیناً خارج نہیں ہے۔ ہم یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ وہ اس دنیا سے اپنا فریضۂ نیابت پوری طرح انجام دے کر تشریف لے گئے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ عالم انسانی کے نہ صرف سب سے پہلے انسان، سب سے پہلے رسول، بلکہ سب سے پہلے حکمراں بھی تھے۔ لیکن اگر کوئی شخص ان کی حکومت کے حدود اربعہ کی تعیین اور اس کے باشندوں کی مردم شماری شروع کر دے تو کیا اس کی یہ روش صحیح ہوگی؟ اسلامی حکومت کا رقبہ اور اس کے باشندوں کی تعداد اپنے اپنے زمانے کے لحاظ سے گھٹتی بڑھتی رہی ہے اس لیے مساحت و مردم شماری کے کسی خاص پیمانے سے اس کو ناپنا صحیح نہیں ہے۔ جس طرح حضرت یوسف، حضرت داؤد

حضرت سلیمان اور سیدنا محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام کو اللہ نے حکومت عطا کی تھی۔ حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت ابراہیم علیہم السّلام کو بھی اس نے حکومت عطا کی تھی۔ رقبے اور تعداد کا جزوی فرق، حکومت کی حقیقت کو تبدیل نہیں کر سکتا۔

ممکن ہے میرا جواب لوگوں کو نیا معلوم ہو۔ لیکن قرآن نے رسولوں کے بارے میں اللہ کی جس سنت کا ذکر کیا ہے ان کو غالب کرنے کے جو صریح وعدے کیے گئے ہیں اور ایفائے وعدہ کے جو واقعات بیان ہوئے ہیں ان کو سامنے رکھ لیا جائے تو اس جواب کی صحت میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا۔

اس سوال کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بوجھ اتنا ہی ڈالا ہے جو ان کی قوت و استطاعت کے اندر ہو اس نے کسی کو بھی تکلیف مالا یطاق نہیں دی ہے۔ فریضۂ اقامت صلوٰۃ ہو یا فریضۂ اقامت دین، بندے کی اصل ذمّہ داری یہ ہے کہ وہ اس کو انجام دینے اور اس کو بروئے کار لانے میں اپنی پوری قوت اور تمام صلاحیت صرف کر دے اور اس کی جدوجہد میں کوتاہی نہ کرے۔ اگر اس نے یہ کر لیا تو کامیاب ہے۔ اس صورت میں بھی کہ اس نے بالفعل اس فریضے کو انجام دے دیا ہو اور اس صورت میں بھی کہ وہ بالفعل اس کو انجام دینے پر قادر نہ ہو سکا ہو۔ جب حقیقت یہ ہے تو پھر کسی نبی و رسول کی شہادت حق کو ناقص اسی وقت قرار دیا جا سکتا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ ان میں سے کسی نے جدوجہد میں کمی کی تھی یا کوتاہی برتی تھی لیکن ہمیں کتاب و سنّت نے یہ یقینی علم عطا کیا ہے کہ کسی نبی نے بھی شہادت حق یا فریضۂ اقامت دین

میں کوئی کوتاہی نہیں کی تھی۔ اس لیے کسی نبی کی شہادت حق کو ناقص قرار دینے کی ادنیٰ ترین وجہ بھی موجود نہیں ہے۔ یہ جواب بھی اپنی جگہ بالکل صحیح ہے لیکن جیسا کہ میں نے پہلے جواب میں عرض کیا واقعہ کے طور پر یہ کہنا ہی صحیح نہیں ہے کہ بہت سے رسولوں نے اسلامی حکومت قائم نہیں کی ہے۔ الجھن اس لیے پیش آتی ہے کہ لوگ لفظِ حکومت بول کر اس سے موجودہ دَور کی کسی حکومت کے لوازمات مراد لیتے ہیں۔

ہم پوری شریعت کے مخاطب ہیں

مسلمان جس ملک میں بھی آباد ہوں وہ شریعت اسلامیہ کے تمام انفرادی و اجتماعی احکام کے مخاطب ہیں وہ ان احکام کے مخاطب بھی ہیں جو مکی آیتوں میں نازل ہوئے اور ان احکام کے مخاطب بھی ہیں جو مدنی آیتوں میں نازل ہوئے۔ نزولِ قرآن کی تکمیل سے لے کر آج تک اور آج سے لے کر قیامت تک جو گروہ بھی ایمان لایا ہے یا آئندہ لائے گا وہ پورے قرآن کا مخاطب اور تمام کے تمام اسلامی احکام کا ان شروط و حدود کے ساتھ مکلّف ہے جو کتاب و سنت نے مقرر کی ہیں۔

المسلم ملتزم بحکم الاسلام حیث ما یکون (شرح السیر الکبیر جلد ۴ صفحہ ۱۲۸)

مسلمان جہاں کہیں بھی ہو اسلام کے حکم کا ملتزم ہے (یعنی اسلامی احکام کی پابندی اس پر لازم ہے)

یہ چھوٹا سا جملہ امتِ مسلمہ کا ایک ایسا عقیدہ ہے جس سے آج تک ائمۂ دین اور علمائے امت میں سے کسی ایک نے بھی اختلاف نہیں کیا ہے۔ یہ بات

کوئی امام وقت سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ کسی ملک کی مسلمان آبادی شریعت کے اجتماعی احکام کی مخاطب ہی باقی نہ رہے۔ لیکن اس دور میں غلبۂ اسلام اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی جدوجہد سے راہِ فرار اختیار کرنے کے لیے کچھ ایسے لوگ ضرور موجود ہیں جو خود ساختہ باتیں کہہ کر اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ اب سے کچھ پہلے بعض لوگوں نے حدود و تعزیرات کے بارے میں یہ عذر پیش کیا تھا کہ عام مسلمان ان احکام کو نافذ کرنے کے لیے سرے سے مخاطب و مکلّف ہی نہیں ہیں بلکہ ان کو نافذ کرنے کے مخاطب و مکلف مسلمانوں کے اولوالامر یعنی حکام ہیں اور چونکہ یہاں اسلامی حکومت قائم نہیں ہے۔ اس لیے ان احکام کو یہاں نافذ کرنے کی ذمہ داری ہی ساقط ہے۔ چلیے چھٹی ملی۔ عام مسلمان مخاطب نہیں، حکام موجود نہیں اس لیے حدود و تعزیرات کی عدم تنفیذ کا غم پالنے کی ہمیں کیا ضرورت۔ فرشتے آکر اسلامی حکومت قائم کریں گے اور جب وہ کسی مسلمان کے سر پر امامت کا تاج رکھ دیں گے تو اس وقت یہ مسئلہ قابلِ غور ہوگا۔

اس عذر لنگ کا مفصل جواب مولانا صدرالدین اصلاحی نے اپنی کتاب "فریضۂ اقامت دین" میں دیا ہے۔ دو وجوہ سے یہ عذر اتنا لنگڑا ہے کہ دو قدم بھی نہیں چل سکتا۔ ایک یہ کہ قرآن میں حدود و تعزیرات کے احکام کا مخاطب اولوالامر کو نہیں، بلکہ پوری امت مسلمہ کو بنایا گیا ہے۔ دوسری یہ کہ ہر عاقل سمجھتا ہے کہ کسی ملک کی حکومت دراصل اس ملک کے عوام کی نمائندہ ہوتی ہے۔ عوام انتشار اور فوضویت سے بچنے کے لیے اپنے اختیارات ایک فرد یا چند افراد کے حوالے کر دیتے ہیں اور پھر وہ لوگ ان کی نیابت میں حکومت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ مسلمانوں

کے اولوا الامر بھی ان کی نیابت ہی میں تنفیذ احکام کے اختیارات استعمال کرتے ہیں۔ اس پہلو سے بھی حدود و تعزیرات کے احکام کی اصل مخاطب پوری امت ہے نہ کہ صرف اولوا الامر۔

اب ایک عرصے کے بعد اسی دعوے کو ایک دوسرے دعوے کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ دعوے کی شکل ذرا سی بدل گئی ہے لیکن نتیجے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ نیا دعویٰ یہ ہے کہ حدود و تعزیرات اور دوسرے اجتماعی احکام کا مخاطب ہے تو پورا مسلم معاشرہ، مگر بے اختیار معاشرہ نہیں، بلکہ آزاد و با اختیار معاشرہ، بے اختیار مسلم معاشرہ شریعت کے اجتماعی احکام کا سرے سے مخاطب نہیں ہے۔ مدعی نے یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ بے اختیار مسلمان اس بات کے بھی مکلف نہیں ہیں کہ وہ حالات کو بدلنے اور اسلامی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کریں۔ ان کے نزدیک اجتماعی احکام کی نوعیت یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کا با اختیار معاشرہ وجود میں آجائے تو اس وقت مسلمان ان اجتماعی احکام کے مخاطب و مکلف ہوں گے، اس سے پہلے وہ ان کے مخاطب نہیں ہیں ان کے نزدیک تمام انفرادی و اجتماعی احکام کو نافذ کرنے یا مختصر لفظوں میں اسلامی حکومت قائم کرنے کو ہندوستان جیسے ملک میں اسلامی مشن قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ یہاں مسلمانوں کا فریضہ صرف انذار و تبشیر اور انفرادی احکام پر عمل کرنا ہے اس سے زیادہ کے نہ وہ مخاطب ہیں نہ مکلف۔

جیسا کہ اوپر کہا گیا نتیجے کے لحاظ سے یہ موقف اس موقف سے مختلف نہیں ہے جس کا ذکر اوپر گزرا۔ پہلے موقف کے حامی نے اولوالامر کو مخاطب قرار دے کر

جان چھڑائی تھی اور اس موقف کے موجد نے با اختیار مسلم معاشرے کو مخاطب قرار دے کر غلبہ اسلام کی جدوجہد کو ضروری قرار دیا ہے۔ موجد کا لفظ میں نے بالقصد استعمال کیا ہے اس لیے کہ آج تک ائمہ دین اور علمائے دین میں سے کسی نے یہ بات نہیں کہی ـــ اس بہت بڑے دعوے کے لیے بہت بڑی شرعی دلیل کی ضرورت تھی لیکن وہ ہے کہاں؟ اس لیے اس کو ثابت کرنے کے لیے دو مزید دعوے کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ اجتماعی احکام مدینہ منورہ میں نازل ہوئے جب کہ مسلمانوں کا با اختیار معاشرہ بن چکا تھا اور ان کی با اختیار سیاسی تنظیم قائم ہو چکی تھی اس لیے ان احکام کا مخاطب با اختیار معاشرہ ہی ہو سکتا ہے دوسرا یہ کہ اجتماعی احکام مثلاً زانی پر حد جاری کرنے کے حکم کی نوعیت وہی ہے جو زکوٰۃ کے حکم کی نوعیت ہے جس طرح زکوٰۃ کا حکم مطلق نہیں بلکہ مقید ہے اسی طرح حدود و تعزیرات کے احکام بھی مطلق نہیں بلکہ مقید ہیں۔ یعنی جس طرح زکوٰۃ اس وقت واجب ہوتی ہے جب نصاب موجود ہو۔ اگر نصاب موجود نہ ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہے کیونکہ نصاب کی تحصیل کو شریعت نے واجب نہیں کیا ہے۔ اسی طرح جب اسلامی حکومت موجود ہو تو حدود و تعزیرات کو نافذ کرنا واجب ہے اگر وہ موجود نہ ہو تو واجب نہیں ہے اور جس طرح کوشش کر کے نصاب حاصل کرنا واجب نہیں اسی طرح کوشش کر کے اسلامی حکومت حاصل کرنا بھی واجب نہیں ہے۔ یہ دونوں دعوے خود محتاج دلیل ہیں مگر انہیں کو پہلے دعوے کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے۔

اس سلسلے میں پہلا سوال یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں اجتماعی احکام کا

نازل ہونا اس بات کے لیے دلیل کس طرح بن جائے گا کہ اب ان احکام کے نازل ہو چکنے کے بعد اگر کسی ملک میں مسلمانوں کا معاشرہ بے اختیار ہو جائے اور اس کے ہاتھ سے حکومت کا اقتدار چھن جائے تو وہ اجتماعی احکام کا مخاطب ہی باقی نہیں رہے گا۔ اجتماعی احکام کی مخاطبیت کے لیے یہ "قید" کیا کسی آیت میں ہے، کسی حدیث میں ہے، کسی امام کا مذہب ہے، کسی عالم و فقیہ کا قول ہے؟ آخر اس قید کی دلیل کیا ہے۔ کیا اس دعوے کے موجد قرآن کے مطلق احکام کو مقید کرنے کے لیے کسی دلیل شرعی کی ضرورت نہیں سمجھتے اور اپنے جیسے ہر مسلمان کو اختیار دیتے ہیں کہ وہ نزول احکام کی زمانی ترتیب کی بنا پر جس مطلق حکم کو چاہے مقید کر دے۔ اگر وہ اس دعوے کی فتنہ انگیزی کا احساس کرتے تو وہ ہرگز اس کی جرأت نہ کرتے۔

فرض کیجیے، کوئی شخص کہے کہ جن جن انفرادی و شخصی احکام کی خلاف ورزی پر سزائیں مقرر کی گئی ہیں ان کا دورِ اقتدار میں نازل ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا مخاطب و مکلف بھی با اختیار معاشرہ ہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں تک ان شخصی احکام پر عمل کا تعلق ہے اس کے لیے اقتدار کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے باوجود وہ مکے میں نازل نہیں ہوئے۔ مدینے کے دورِ اقتدار میں نازل ہوئے۔ یہ بات ایک مثال سے واضح ہو گی، چوری، زنا شراب نوشی کی حرمتیں شخصی احکام ہیں اور یکساں طور سے ہر مسلمان سے یہ مطلوب ہے کہ وہ چوری نہ کرے، زنا نہ کرے اور شراب نہ پیے اور شریعت کے اس مطالبے پر عمل کرنے کے لیے کسی اقتدار حکومت کی ضرورت نہیں ہے لیکن ہم

دیکھتے ہیں کہ خمر، قمار، ربوا اور نکاحِ مشرکہ کی حرمتیں مکّے میں نہیں، بلکہ مدینے کے دورِ اقتدار میں نازل ہوئیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ان تمام حرمتوں کی خلاف ورزی پر شریعت اسلامیہ نے حدود و تعزیرات مقرر کی ہیں اور ان کی تنفیذ کے لیے اقتدار حکومت کی ضرورت ہے۔ "زانی کو کوڑے مارو" اور "شرابی کو کوڑے مارو"۔ دونوں کے لیے اقتدار چاہیے۔ اکثر و بیشتر حدود تعزیرات دراصل شخصی احکام ہی کا اجتماعی رخ ہیں اسی لیے شریعت نے مناسب نہیں سمجھا کہ بے اختیار معاشرے کو ان شخصی احکام کا مخاطب و مکلف بنائے جن پر اس نے حدود مقرر کی ہیں۔ جب مدینے میں حدود نافذ کرنے کا اقتدار حاصل ہو گیا تب اس نے مسلمانوں کو ان حرمتوں کا مخاطب و مکلّف بنایا۔ لہٰذا مسلمانوں کا بے اختیار معاشرہ خمر، قمار، ربوا اور نکاح مشرکہ کی حرمتوں کا مخاطب و مکلف نہیں ہے۔

اس کے جواب میں اگر یہ کہا جائے کہ ان حرمتوں کے مدینے میں نازل ہونے کی وجہ اقتدار نہیں، بلکہ تدریج فی الاحکام کی حکمت ہے تو عرض کیا جائے گا کہ جن احکام پر عمل کرنے کے لیے اقتدار کی ضرورت نہیں ہے وہ تدریجی طور پر مکّہ ہی میں کیوں نازل نہ ہوئے وہاں کیا مانع تھا؟ مثال کے طور پر تیرہ برس کی مدّت میں حرمت خمر کے تدریجی احکام مکّہ میں کیوں نازل نہیں ہو سکتے تھے جب کہ شراب سے اجتناب کے لیے اقتدار حکومت کی ضرورت نہیں اس کے لیے مدینے کے دورِ اقتدار ہی کو کیوں منتخب کیا گیا۔ اس کا سبب جیسا کہ اوپر دکھایا گیا یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب تک اس حرمت کی خلاف ورزی پر حد

نافذ کرنے کی قدرت نہ ہو مسلمانوں کو اس حرمت کا مخاطب و مکلّف بنانا مناسب نہیں سمجھا گیا۔

دلیل شرعی کے بغیر مطلق احکام مقیّد نہیں ہو سکتے

غور کیجیے اس استدلال کا کیا جواب ہے، اور اگر جواب میں کوئی مزید عقلی تیر تکّہ چلایا جائے تو پھر اس کے جواب میں دوسرا شخص بھی عقلی تیر تکّے چلائے گا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہی نا کہ شریعت کے مطلق احکام کو مقید کرنے کا مسئلہ ایک کھیل بن جائے گا۔ اگر مقصد یہ ہو کہ جماعت اسلامی کے نصب العین کو غلط ثابت کر دیا جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دینی مسائل کا حلیہ بگڑتا ہے تو بگڑے، تب تو کوئی بات نہیں ورنہ سوچنا چاہیے کہ نئے مدعی کے اس بے بنیاد دعوے نے شریعت کے مطلق احکام کو بے دلیل مقید کرنے کا کتنا خطرناک دروازہ کھولا ہے۔

اس نئے دعوے کے ثبوت میں زکوٰۃ کے مسئلے کو بار بار مختلف انداز میں اس طرح پیش کیا گیا ہے جیسے یہ کوئی بہت بڑا ہتھیار ہاتھ لگ گیا ہو حالانکہ یہ ہتھیار پھُس پھسی لکڑی کا ہے۔ جناب مدعی زکوٰۃ کے حکم کو مقید اور نماز کے حکم کو مطلق سمجھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک کو مقید اور دوسرے کو مطلق سمجھنے کی دلیل کیا ہے۔ قرآن میں جس طرح نماز کا حکم مطلق ہے اسی طرح زکوٰۃ کا حکم بھی مطلق ہے۔ آخر زکوٰۃ کے حکم کو مقید قرار دینے کی کوئی شرعی دلیل تو ہوگی۔ جناب مدعی کو یہ بات معلوم ہی ہوگی کہ زکوٰۃ کے حکم کو مقید حدیث نبوی

اور اجماعِ امت نے قرار دیا ہے۔ کسی مسلمان کی شخصی رائے نے اس کو مقید نہیں قرار دیا ہے۔ مدعی سے ہمارا مطالبہ یہی ہے کہ وہ قرآن کے اجتماعی احکام کو مقید ثابت کرنے کے لیے کوئی شرعی دلیل عنایت فرمائیں۔ کسی دعوے کو بار بار دہرانے سے وہ ثابت نہیں ہو جاتا۔

اصول دین کا ایک متفقہ مسئلہ

اصول دین کا ایک متفقہ مسئلہ یہ ہے کہ شریعت کے مطلق احکام کے اسباب کو حاصل کرنا واجب ہے اس لیے کہ سبب کی حیثیت موقوف علیہ کی ہوتی ہے اور کسی مطلق حکم کے موقوف علیہ کی تحصیل کے وجوب میں عقلمندوں کے نزدیک کسی شبہے کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ علمائے امت کے نزدیک حدود و تعزیرات اور شریعت کے دوسرے اجتماعی احکام مطلق احکام ہیں اور ان پر عمل کرنے کے لیے نصب امام کی حیثیت سبب اور موقوف علیہ کی ہے۔ اسی لیے وہ نصبِ امام کو واجب کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی مقتدر امام کا تقرر مسلمانوں کے حاکمانہ اقتدار کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے اسلامی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد آپ سے آپ واجب قرار پاتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جس سے جناب مدعی کو اختلاف ہے۔ اس متفقہ اصول دین کو رد کرنا چونکہ بے عقلی کی بات ہوتی اس لیے انھوں نے یہ آسان نسخہ تجویز کیا کہ شریعت کے اجتماعی احکام کو مقید قرار دے دیں اس کے لیے جب دلیل طلب کی گئی تو زکوٰۃ کے حکم کو پیش کر دیا اور جب یہ سوال سامنے رکھا گیا کہ زکوٰۃ کے مقید ہونے کی شرعی دلیل تو موجود ہے۔ اجتماعی احکام کے مقید ہونے کی

شرعی دلیل کیا ہے تو صرف یہی نہیں کہ کوئی شرعی دلیل نہیں دی گئی بلکہ سائل کو نادان کہہ دیا گیا۔

اس روش کا انجام یہی تو ہو سکتا ہے کہ دوسرا شخص کھڑا ہو اور دعوی کرے کہ نماز کا حکم بھی مطلق نہیں بلکہ مقید ہے۔ جناب مدعی دلیل طلب کریں تو وہ زکوٰۃ کے مسئلے کو پیش کر دے گا۔ گویا قرآن کا ہر مطلق حکم صرف اس لیے مقید ہو جائے گا کہ زکوٰۃ کا حکم مقید ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو دینی مسائل میں اس مہلک کھیل سے محفوظ رکھے اور لطیفہ یہ ہے کہ جناب مدعی کے نزدیک جماعت اسلامی کا نصب العین بے دلیل ہے اور ان کا دعویٰ نا قابل تردید۔ ع

ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

شرح مقاصد کی دو عبارتیں

واقعہ یہ ہے کہ اجتماعی احکام کو مقید قرار دینے کے لیے قرآن و حدیث میں کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے امت ہمیشہ انہیں مطلق مانتے آئے ہیں۔ عقائد و کلام کی کتابوں سے بیسیوں عبارتیں اس کی تائید میں نقل کی جا سکتی ہیں لیکن طوالت کے خوف سے میں صرف شرح مقاصد کی دو عبارتیں نقل کرتا ہوں۔

نصب امام کے شرعی وجوب کی دوسری دلیل دیتے ہوئے لکھا گیا ہے:۔

الثانی ان الشارع امر	دوسری دلیل یہ ہے کہ شارع نے حدود
باقامۃ الحدود وسد الثغور	کی اقامت، سرحدوں کے استحکام جہاد
وتجھیز الجیوش للجھاد وکثیر	کے لیے لشکروں کے انتظام اور دوسرے
من الامور المتعلقۃ بحفظ النظام	بہت سے امور کا حکم دیا ہے جو حفظ نظام

وحمایۃ بیضۃ الاسلام مما لایتم الا بالامام ومما لایتم الواجب المطلق الا بہ وکان مقدورًا فھو واجب علیٰ ما مرفی صدر الکتاب۔

اور اسلامی جماعت کی حفاظت سے متعلق ہیں۔ یہ سب وہ امور ہیں جو امام کے بغیر تمام نہیں ہوتے اور واجب مطلق جس چیز کے بغیر تمام نہ ہوا اور وہ چیز انسان کی قدرت میں بھی ہو تو وہ چیز بھی واجب ہوتی ہے جیسا کہ کتاب کی ابتدا میں گزر چکا۔

(شرح مقاصد، بحث امامۃ)

اس عبارت نے دو باتیں بالکل واضح کر دیں۔ ایک یہ کہ اقامت حدود وغیرہ ایسے احکام ہیں جو امام کے بغیر انجام نہیں دیے جا سکتے۔ امام کا وجود ان احکام کی صحیح تعمیل کے لیے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ اقامتِ حدود اور اس طرح کے دوسرے احکام واجب مطلق ہیں اور واجب مطلق جس چیز کے بغیر انجام نہ پا سکے وہ چیز بھی واجب ہوتی ہے بشرط یہ ہے کہ اس موقوف علیہ کا حاصل کرنا انسان کی قدرت میں ہو۔ اس عبارت میں جو بات کہی گئی ہے اس سے علمائے اہل السنۃ میں کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ اور اگر کسی غلط اندیش نے کوئی مہمل اعتراض کیا ہے تو انھوں نے اس کا مسکت جواب دیا ہے۔ چنانچہ شرح مقاصد ہی میں ایک بے معنی اعتراض اور اس کا جواب مذکور ہے:۔

لا یقال الامر باقامۃ الحدود کقطع السارق مثلاً ان کان مشروطاً بوجود

یہ اعتراض نہیں کیا جا سکتا کہ اقامتِ حدود کا حکم مثلاً چور کا ہاتھ کاٹنا اگر وجود امام کے ساتھ مشروط ہے تو

الامام لم يكن مطلقا فلم يستلزم وجوبه كالامر بالزکاۃ بالنسبۃ الی تحصیل النصاب وان لم یکن مشروطا به فظاهر۔ (شرح مقاصد)	ہاتھ کاٹنے کا حکم مطلق نہ ہوا لہٰذا امام کا تقرر واجب نہ رہا جیسے زکوٰۃ کا حکم تحصیل نصاب کی نسبت سے اور اگر وجود امام کے ساتھ مشروط نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ امام کا تقرر واجب نہ ہوگا۔

اعتراض کا حاصل یہ ہے کہ اہل السنۃ والجماعۃ اگر حدود وتعزیرات کے حکم کو وجود امام کے ساتھ مشروط مانتے ہیں تو پھر یہ حکم مطلق نہیں رہا اور جب مطلق نہ رہا تو پھر نصب امام واجب نہ ہوگا۔ کیونکہ امام کا تقرر تو اس وقت واجب ہو سکتا ہے جب اقامت حدود کا حکم مطلق ہو۔ اس کی مثال یہ ہے کہ زکوٰۃ کا حکم وجوب نصاب کے ساتھ مشروط ہے لیکن نصاب کی تحصیل کسی مسلمان پر واجب نہیں ہے۔ اور اگر وہ اقامت حدود کے حکم کو وجود امام کے ساتھ مشروط نہیں مانتے تب تو ظاہر ہے کہ امام کا تقرر مسلمانوں پر واجب نہ ہوگا۔ اس اعتراض کو پڑھ کر راقم الحروف کو احساس ہوا کہ ہمارے نئے مدعی نے اجتماعی احکام کو مقید قرار دینے کے لیے زکوٰۃ کی مثال اسی اعتراض سے لی ہے لیکن اہل السنۃ والجماعۃ کی طرف سے اس کا جو جواب دیا گیا ہے اس کو انھوں نے بالکل نظرانداز کر دیا ہے۔ جواب ملاحظہ کیجیے۔

لانا نقول فرق بین تقیید الوجوب فھھنا الوجوب مطلق ای لم یقید	یہ اعتراض اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ ہم (اہل السنۃ والجماعۃ) کہتے ہیں کہ وجوب کے مقید ہونے اور واجب کے

ولم يشترط بوجود الامام	مقید ہونے میں فرق ہے تو یہاں (جس
والواجب ای المامور به مشروطٌ به	مسئلے میں بحث ہو رہی ہے) وجوب مطلق
وموقوف عليه كوجوب	ہے یعنی وجود امام کے ساتھ مقید و
الصلوٰة المشروطة	مشروط نہیں ہے اور واجب یعنی مامورٌ
بالطهارة واما في الزكوٰة	(جس چیز کا حکم دیا گیا ہے) وجود امام کے
فالوجوب مشروط بحصول	ساتھ مشروط اور اس پر موقوف ہے
النصاب حتى اذا انتفىٰ	ان احکام کے وجوب کی مثال ایسی
فلا وجوب	ہے جیسے نماز کا وجوب جو طہارت کے
	ساتھ مشروط ہے اور زکوٰۃ میں خود
	اس کا وجوب ہی حصول نصاب کے
	ساتھ مشروط ہے یہاں تک کہ اگر
	نصاب نہ ہو تو زکوٰۃ کا وجوب ہی نہ ہوگا۔

جواب کا حاصل یہ ہے کہ معترض نے وجوب کے مقید ہونے اور واجب کے مقید ہونے کا فرق نہ سمجھنے کی وجہ سے یہ اعتراض کیا ہے فرق یہ ہے کہ حدود کا وجوب امام کے وجود کے ساتھ مقید و مشروط نہیں ہے بلکہ مطلق ہے۔ ہاں اقامتِ حدود کے لیے امام کا وجود شرط اور موقوف علیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً چوری کی حد، قطعِ ید کا وجوب، وجود امام کے ساتھ مشروط نہیں ہے کہ اگر امام موجود نہ ہو تو یہ وجوب ساقط ہو جائے۔ ہاں اس حد کی اقامت و تنفیذ وجود امام کے ساتھ مشروط ہے، اگر امام موجود نہ ہو تو کوئی عام آدمی اس حد کو نافذ نہیں کر سکتا۔ اس کو یوں

سمجھو جیسے نماز کا وجوب جس کی صحتِ ادا طہارت کے ساتھ مشروط ہے۔ اگر طہارت حاصل نہ ہو تو نماز کا وجوب ساقط نہیں ہوتا۔ ہاں طہارت کے بغیر نماز صحیح نہ ہو گی۔ معلوم ہوا کہ جس طرح فریضۂ صلوٰۃ کی ادائیگی کے لیے طہارت کی تحصیل واجب ہے اسی طرح فریضۂ حدود کی اقامت کے لیے امام کا تقرر واجب ہے بخلاف زکوٰۃ کے۔ وہاں شریعت نے زکوٰۃ کے وجوب ہی کو حصول نصاب کے ساتھ مشروط قرار دیا ہے۔ اگر نصاب موجود ہو تو زکوٰۃ واجب ہو گی اور اگر موجود نہ ہو تو اس کا وجوب ساقط ہو جائے گا۔ اجتماعی احکام کی مشابہت نماز کے ساتھ ہے زکوٰۃ کے ساتھ نہیں۔ معترض نے بے تمیزی کی وجہ سے ان کو زکوٰۃ کے ساتھ مشابہ قرار دیا ہے۔

اس جواب سے بھی پوری طرح واضح ہوا کہ اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک شریعت کے اجتماعی احکام (مثلاً حدود و تعزیرات) اسی طرح مطلق ہیں جس طرح نماز کا حکم مطلق ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان احکام کو مقید کرنے کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص ان اجتماعی احکام کو مقید قرار دیتا ہے تو وہ ایک بالکل بے دلیل بات کہتا اور اہل السنۃ والجماعۃ کے متفقہ مسلک کے خلاف مسلک اختیار کرتا ہے اور دین میں ایک سخت فتنے کا دروازہ کھولتا ہے۔

کیا ہم اقامتِ صلوٰۃ کی تکمیل کر رہے ہیں؟

شریعت کے بہت سے احکام تو ایسے ہیں کہ آج ہم ناقص حد تک بھی ان کی تعمیل نہیں کر سکتے لیکن جن فرائض کو ادا کر کے ہم میں کے بہت سے افراد مطمئن ہو بیٹھے ہیں۔ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ

شرعی نقطۂ نظر سے ہمارے روزے اور ہماری نمازیں بھی مکمل نہیں ہیں۔ اس لیے کہ علمائے امّت نے امام المسلمین کے فرائض کی فہرست میں ارکانِ اربعہ کی اقامت کو بھی داخل کیا ہے کسی کتاب میں اقامۃ الجمعۃ والاعیاد واخذ الصدقات (جمعہ اور عیدین کی اقامت اور زکوٰۃ کی تحصیل) کے الفاظ آئے ہیں اور کسی میں اقامتِ ارکان الاسلام کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں احادیث میں آتا ہے کہ جب تک امام اقامتِ صلوٰۃ کرتا رہے اس کے خلاف بغاوت صحیح نہیں معلوم ہوا کہ اقامتِ صلوٰۃ امام کے اہم فرائض میں سے ایک فریضہ ہے۔

ارکان اسلام کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ ائمۂ صلوٰۃ، محصلین زکوٰۃ اور امیر الحج کا تقرر اسی طرح رمضان کے روزوں اور عیدین کی نماز کے لیے رویت ہلال کی شہادت قبول کرنے والے قاضیوں کا تقرر امام خود یا اپنے نائبین کے ذریعہ کرے گا اور یہی تقرر شرعًا صحیح ہوگا۔

اس تفصیل سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ جو لوگ ارکانِ اربعہ کو ہر پہلو سے محض انفرادی احکام کا درجہ دیتے ہیں ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ آج ہم جن اماموں کے پیچھے نمازیں ادا کر رہے ہیں اور جن مفتیوں کے فتووں پر روزے رکھ رہے ہیں یہ ان فرائض کو ادا کرنے کی اعلیٰ نہیں بلکہ ادنیٰ — اور کامل نہیں بلکہ ناقص شکل ہے۔ خلافت کا اقتدار صرف اقامت حدود ہی کے لیے ضروری نہیں ہے، بلکہ اقامت ارکان اربعہ کی تکمیل کے لیے بھی ضروری ہے۔ جو لوگ اعلاءِ کلمۃ اللہ اور غلبۂ اسلام کی جدوجہد سے الگ رہ کر اپنی نمازوں اور روزوں کو مکمل سمجھ رہے ہیں اور اس پر مطمئن ہیں، انہیں غور کرنا چاہیے کہ ان کا یہ اطمینان صحیح ہے یا غلط؟

ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی صورت

بعض لوگ ایسا سمجھ سکتے ہیں کہ جب تک ہم خلافت علیٰ منہاج النبوۃ یا اسلامی حکومت بالفعل قائم نہ کردیں اس وقت تک اقامت دین کی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ہندوستان میں غیر مسلموں کی اکثریت ہے۔ اور یہاں بالفعل اسلامی حکومت قائم نہیں ہو سکتی اِس لیے ہم اس فریضے کے مکلف نہیں ہیں۔

ایک مسلّمہ اصول

لیکن ایسا سمجھنا دین کے ایک مسلمہ اصول سے غفلت کا نتیجہ ہوگا۔ وہ مسلمہ اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر حکم کے سلسلے میں بندے کی اصل ذمہ داری یہ قرار دی ہے کہ وہ اسے انجام دینے کی سعی کرے اور اس سعی میں اپنی حد استطاعت تک کوتاہی نہ کرے۔ اگر اس نے سعی کر لی تو اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو گیا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انسان جب تک کسی حکم کی تعمیل میں کامیاب نہ ہو جائے اور بالفعل اس پر عمل نہ کر لے اس وقت تک وہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، انہیں اپنے خیال کی تصحیح کر لینی چاہیے۔ اس اصول کو دین کے ایک دوسرے مسلّمہ اصول سے تقویت ملتی ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان پر اتنی ہی ذمہ داری عائد کرتا ہے جو

اس کی حد استطاعت کے اندر ہو وہ کسی پر کوئی ایسا بوجھ نہیں ڈالتا جسے وہ اٹھا نہ سکے۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔ (بقرہ : ۲۸۶) — اللہ تعالیٰ ہر نفس پر اتنی ہی ذمہ داری ڈالتا ہے جو اس کی حدّ استطاعت میں ہو۔

اس اصول سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی انسان کسی ایسے حکم کا مکلّف نہیں ہے جو اس کی طاقت سے باہر ہو۔ دوسری یہ کہ جس حکم کا وہ مکلّف ہے اس میں بھی اس کی ذمہ داری اسی حد تک ہے جو اس کے مقدور کے اندر ہو — اللہ کا تقویٰ تمام دینی احکام کی روح ہے اور اِتَّقُوا اللّٰہَ (اللہ کا تقویٰ اختیار کرو) کے حکم سے قرآن بھرا ہوا ہے لیکن اس کلی اور جامع حکم کی تعمیل کا مطالبہ بھی بندے کی استطاعت کے اندر ہی ہے۔

فَاتَّقُوا اللّٰہَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (تغابن : ۱۶) — پس (اے مسلمانو!) جہاں تک تم سے ہو سکے اللہ سے ڈرتے رہو۔

اگر مومن اپنی استطاعت کی حد تک تقویٰ اختیار کرے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس نے تقویٰ کا حق ادا کر دیا۔ یہی بات ہے جو سورہ آل عمران میں کہی گئی ہے:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ (آلعمران : ۱۰۲) — اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو جیسا کہ حق ہے ڈرنے کا۔

ظاہر ہے کہ کسی کے حق کی ادائیگی استطاعت کے اندر ہی ممکن ہے اس سے باہر نہیں — جزوی احکام میں بھی بندے کی مزید تسلّی و تسکین کے لیے

اللہ تعالیٰ نے استطاعت کی قیدیں لگائی ہیں۔ مثلاً فرمایا گیا ہے:۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ (انفال ر ۸)	اور دشمنوں سے مقابلہ کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے قوت اور تیار بندھے رہنے والے گھوڑے مہیّا رکھو۔

جب فرضیت حج کا حکم نازل ہوا تو اس میں بھی استطاعت کی قید لگائی گئی۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (آل عمران ر ۱۰)	اور لوگوں پر فرض ہے کہ وہ خدا کے لیے خانۂ کعبہ کا حج کریں جس کو وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو۔

اسی طرح مطلّقہ بیوی کی رہائش کے لیے گھر مہیا کرنے اور بچّے کی پرورش کا خرچ برداشت کرنے کے احکام دیتے ہوئے کہا گیا ہے:۔

اَسْكِنُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنْتُمْ مِّنْ وُّجْدِكُمْ (الطلاق: ر ۱)	مطلقہ عورتوں کو (عدت کے لیے) اپنے مقدور کے مطابق وہیں رکھو جہاں تم خود رہو۔
لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا اٰتٰهُ اللّٰهُ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَا اٰتٰهَا (الطلاق: ر ۱)	جس کو وسعت ہو اس کو چاہیے کہ اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرے اور جس کی آمدنی تنی تلی ہو وہ جتنا اس کو خدا نے دیا ہے اسی کے مطابق خرچ کرے۔ خدا نے جس کو جتنا دے رکھا ہے اس سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے احکام میں اسی اصول کی توضیح کی ہے:

ثَبَتَ فِی الصَّحِیحَینِ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال: قَالَ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا امرتکم بامر فَاتُوا منہ مَا اسْتَطَعْتُمْ. ومانَهَيْتُكُمْ عَنْـہ فَاجْتَنِبُوْہُ۔ (ابن کثیر ج ۲ ص ۳۷۶)	بخاری ومسلم میں حضرت ابوہریرہ سے یہ حدیث مروی ہے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب میں تمہیں کسی چیز کا حکم دوں تو جہاں تک تمہارا بس چلے اسے انجام دو اور جب کسی چیز سے روک دوں تو اس سے اجتناب کرو۔

صحابہ کرام سے سمع وطاعت کی بیعت لیتے وقت حضور اپنی طرف سے یہ ارشاد فرمادیا کرتے تھے کہ سمع وطاعت کا یہ معاہدہ تمہاری استطاعت کے اندر ہے اس سے باہر نہیں۔

عَنِ ابنِ عُمَرَ قَالَ كُنَّا نُبَايِعُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فَيَقُوْلُ لَنَا فِيْمَا اسْتَطَعْتُمْ۔ (ترمذی، ابواب السیر)	حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سمع وطاعت کی بیعت کرتے تو آپ ہم لوگوں سے فرماتے یہ سمع وطاعت انھیں چیزوں میں ہے جو تمہاری استطاعت کے اندر ہوں۔
اُمَيْمَةُ بنت رُقیقۃ تقولُ بایعتُ رسولَ اللّٰہ صلی اللّٰہُ	حضرت امیمہ فرماتی ہیں کہ میں نے عورتوں کی ایک جماعت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِی نسوۃٍ فقالَ لَنَا فِیمَا استطعتنَّ وَ اطقتنَّ قُلْتُ اللهُ وَرَسُولُهُ اَرْحَمُ بِنَامِنَّا بِاَنْفُسِنَا۔ (ترمذی ابواب السیر)

سے بیعت کی تو آپ نے ہم لوگوں سے فرمایا یہ بیعت ان چیزوں میں ہے جو تمہاری استطاعت اور طاقت کے اندر ہوں۔ میں نے کہا اللہ اور اس کے رسول ہم پر خود ہم سے زیادہ مہربان ہیں۔

کتاب وسنت کے ان نصوص نے بندۂ مومن کے دل میں یہ اطمینان پیدا کر دیا کہ اللہ و رسول کی طرف سے اس کو کسی ایسے امر کا مکلّف نہیں بنایا جائے گا جو اس کی طاقت سے باہر ہو۔ نیز یہ کہ وہ جس امر کا بھی مکلّف بنایا جائے گا اس کی انجام دہی میں اس کی حد استطاعت کا لحاظ رکھا جائے گا۔

شرعی فرائض کی ایک قسم

کچھ شرعی فرائض ایسے ہیں جن کا تعلق مکلفؔ مامور انسان کی اپنی ذات سے ہوتا ہے یعنی وہ بذاتِ خود مامور ہوتا ہے کہ ان پر عمل کر کے انہیں بروئے کار لائے اور شریعت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو۔ مثال کے طور پر فریضۂ صلوٰۃ کو سامنے رکھیے اس فریضے کو ادا کرنے کے لیے سب سے پہلی چیز جو کسی مامور پر واجب ہوتی ہے یہ ہے کہ وہ ادا کرنے کا اہتمام اور اس کے لیے سعی کرے۔ اگر اس نے سعی کر لی اور کسی ایسے مانع کی وجہ سے نماز ادا نہ کر سکا جس پر اسے قابو نہ تھا تو اس کی ذمہ داری پوری ہو گئی اور وہ آخرت کی باز پرس سے بچ گیا۔ فرض کیجیے کوئی مسلمان کسی وقت کی نماز کا پورا اہتمام کر کے جماعت سے نماز ادا کرنے کے لیے گھر سے روانہ ہوا اور

راستے میں کسی حادثے کا شکار ہو کر دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس صورت میں نہ صرف یہ کہ وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گیا بلکہ اس وقت کی نماز کا اجر بھی اسے مل گیا حالانکہ بالفعل اس نے وہ نماز نہیں پڑھی۔ دوسری چیز یہ کہ فریضۂ صلوٰۃ کو جس حد تک ادا کرنے کی اس میں استطاعت ہوگی اسی حد تک وہ مکلف ہوگا۔ اگر وہ کھڑے ہو کر نماز ادا نہیں کر سکتا تو بیٹھ کر ادا کرے گا اور بیٹھ کر بھی ادا نہیں کر سکتا تو لیٹ کر اشاروں سے ادا کرنے کا مکلّف ہوگا۔ سعی و کوشش کے بعد ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جانے اور مستحق اجر ہونے کی صراحت ذیل کی آیت میں ہے:۔

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ	اور جو شخص نکلتا ہے اپنے گھر سے
مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ	اللہ و رسول کی طرف ہجرت کے ارادے
ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ	سے پھر (راستے میں) اسے موت آجاتی
فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ	ہے تو اس کا اجر اللہ کے یہاں ثابت
(النساء، ۱۰۰)	ہو گیا۔

روایتوں میں آتا ہے کہ ایک صحابی مکے سے ہجرت کر کے مدینے جانے کے لیے اپنے گھر سے نکلے۔ لیکن ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ مقام تنعیم میں ان کا انتقال ہوگیا۔ جب مدینے اس کی خبر پہنچی تو صحابہ نے کہا کاش وہ مدینے پہنچ کر مرتے تو انہیں پورا اجر ملتا۔ اس کے بعد مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس سے واضح کر دیا کہ انہیں پورا اجر مل گیا۔ پورا اجر ملنے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ انہوں نے اپنی ذمہ داری پوری کر لی تھی۔ احادیث رسول نے توضیح کر دی ہے کہ یہ حکم

صرف ہجرت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من خرج حاجا فمات کتب لہ اجر الحاج الی یوم القیٰمۃ ومن خرج معتمرا فمات کتب لہ اجر المعتمر الیٰ یوم القیٰمۃ ومن خرج غازیا فمات کتب لہ اجر الغازی الیٰ یوم القیٰمۃ۔

(الترغیب والترہیب بحوالہ ابو یعلیٰ)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو (مسلمان) حج کے ارادے سے نکلا پھر (راستے میں) مرگیا تو ان کے لیے قیامت تک حج کرنے والے کا اجر لکھا جاتا رہے گا اور جو عمرے کے ارادے سے نکلا پھر مرگیا تو اس کے لیے قیامت تک عمرہ کرنے والے کا اجر لکھا جاتا رہے گا اور جو اللہ کی راہ میں لڑنے کے لیے نکلا اور مرگیا تو اس کے لیے قیامت تک غازی کا اجر لکھا جاتا رہے گا۔

امام بخاری اور امام مسلم نے ذیل کی حدیث روایت کی ہے:۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال بینما رجل واقف مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعرفۃ اذ وقع عن راحلتہ فاقعصتہ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ ایک شخص میدان عرفات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے اونٹ پر سوار تھے کہ اچانک وہ اپنے اونٹ سے گر گئے اور اونٹ نے ان کی گردن توڑ دی تو

اغسلوہ بماء وسدر و کفنوہ بثوبیہ ولا تخمروا راسہ ولا تحنطوہ فانہ یبعث یوم القیمۃ ملبیا۔ (الترغیب والترہیب بحوالہ بخاری ومسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کو پانی اور بیری سے غسل دو اور انہیں کے دونوں کپڑوں کا کفن بناؤ اور ان کا سر نہ ڈھانکو اور نہ انہیں خوشبو لگاؤ۔ اس لیے کہ یہ قیامت کے دن تلبیہ (لبیک لبیک) پڑھتے ہوئے اٹھائے جائیں گے۔

سورۃ النساء کی مذکورہ بالا آیت اور احادیث کی توضیح نے جو مہتم بالشان اصول ہمیں دیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ ورسول کے کسی حکم پر مخلصانہ نیت اور اس کے لیے جد وجہد ذمہ داری کے اس بوجھ کو ہٹا دیتی ہے جو اس حکم نے انسان کے کندھے پر رکھا تھا۔ مانع کی وجہ سے بالفعل اس حکم کی عدم تعمیل کے باوجود وہ خدا کے سامنے سرخ رو اور اس اجر کا مستحق ہو جاتا ہے جو اس حکم پر عمل کرنے والوں کے لیے مہیا کیا گیا ہے۔

بات واضح ہو چکی ہے لیکن اقامت دین کے نصب العین سے اس کا گہرا تعلق ہے اس لیے اس کی مزید توضیح مقصود ہے۔ حج اور ہجرت کی گزشتہ مثالوں میں ان اعمال سے مانع موت ہوئی ہے۔ موت ایک ایسی چیز ہے جس پر انسان کی عدم قدرت بالکل واضح ہے۔ شبہہ ہو سکتا ہے کہ شاید کسی دوسرے مانع کا یہ حکم نہ ہو۔

اوپر جو اصول بیان کیا گیا ہے اس سے یہ شبہ دور ہو جانا چاہیے لیکن

احکام شرع میں ایسی منصوص مثالیں بھی موجود ہیں جو اس شبہے کو بالکل ختم کردیتی ہیں۔

قتال فی سبیل اللہ کو دین میں جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں امام وقت کی طرف سے اگر نفیر عام ہو جائے تو ہر بالغ اور تندرست مسلمان پر جہاد میں شرکت واجب ہوتی ہے۔ اس صورت حال میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تندرست ہیں اور جہاد میں شرکت کر سکتے ہیں وہ دل کے پورے ولولے کے ساتھ شریک بھی ہونا چاہتے ہیں لیکن شرکت کے لیے سامان کی ضرورت ہے اور سامان ان کے پاس نہیں ہے وہ دوڑ دھوپ کرتے ہیں کہ خود اس کا انتظام کرلیں وہ اپنے مال میں اس کی گنجائش نہیں پاتے وہ دوڑے ہوئے امام کے پاس جاتے ہیں کہ بیت المال سے ان کی مدد کی جائے لیکن بیت المال بھی خالی ہے۔ وہ اب کیا کریں، بے بس ہو کر روتے ہوئے اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں اور غزوے میں شریک نہیں ہوتے۔ ایسے افراد کا کیا حکم ہے، شرکت جہاد کی ذمہ داری ان سے ساقط ہوئی یا نہیں، اس غزوے کے اجر میں وہ شریک ہوئے یا نہیں، کتاب وسنّت دونوں میں اس کی تصریح موجود ہے کہ ان کی مخلصانہ نیت اور سعی وکوشش نے نہ صرف یہ کہ شرکت جہاد کی ذمہ داری ختم کی بلکہ انہیں اجر میں بھی حصّہ دار بنا دیا۔ سورۂ توبہ کی آیت ۹۲ پڑھیے اس میں وہی نقشہ کھینچا گیا ہے جو اوپر گزرا۔ اس آیت نے ایسے لوگوں کو الزام سے بری قرار دیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش خبری سنائی ہے کہ وہ جہاد کے اجر میں شریک ہوئے بلکہ حضور ؐ کے الفاظ تو یہ ہیں کہ مدینے میں قیام کے باوجود وہ سفر جہاد کے ہر مرحلے میں مجاہدین کے ساتھ رہے۔

معلوم ہوا کہ مخلصانہ نیت اور کوشش کے بعد موت سے کم درجے کا مانع بھی انسان کے سر سے ذمہ داری کا بوجھ ہٹا دیتا ہے اور اسے اجر کا مستحق بنا دیتا ہے۔

شرعی فرائض کی دوسری قسم

کچھ شرعی فرائض ایسے ہیں جن کا تعلق دوسروں کے ساتھ ہوتا ہے ایسی ذمہ داریوں میں یہ بات اور واضح ہے کہ ان کا مقصد جد وجہد اور سعی و کوشش کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہاں مامور کی ذمہ داری سرے سے یہ ہوتی ہی نہیں کہ وہ اس چیز کو وجود میں لے آئے بلکہ صرف یہ ہوتی ہے کہ اسے وجود میں لانے کی سعی کرے اس کی واضح مثال اللہ کا یہ حکم ہے۔

مثال اوّل

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَ اَھْلِیْکُمْ نَارًا	اے مومنو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

(التحریم ۶)

یہ آیت دونوں قسم کے احکام کی جامع ہے ایک کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے اور ایک کا تعلق دوسروں سے ہے۔ ہم یہاں اب دوسری قسم کے احکام سے بحث کر رہے ہیں۔ یہ آیت ہر مسلمان کو اس کا بھی مکلف قرار دیتی ہے کہ وہ اپنی بیوی اور اپنی اولاد کو بھی جہنم کی آگ سے بچائے۔ سوچیے، اس تکلیف اور اس ذمہ داری کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب لیا جا سکتا ہے کہ اللہ نے ہر مسلمان کو ذمہ دار قرار دیا ہے کہ وہ اپنی بیوی اولاد اور گھر کے دوسرے لوگوں کے

دلوں میں ہدایت کا نور ڈال دے۔ انہیں خدا کا فرمانبردار بنا دے اور بہرحال انہیں خدا کی نافرمانیوں سے روک دے۔ ظاہر ہے کہ یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا کیونکہ یہ ذمہ داری تو اللہ نے اپنے رسولوں پر بھی نہیں ڈالی۔ ظاہر ہے مسلمانوں کو وہ اس کا مکلف کیسے قرار دے سکتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا اور ان کی بیوی دونوں ہی خدا کی نافرمانی پر اڑے رہے اور عذاب الٰہی میں غرق ہوئے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بغاوت پر جمی رہی اور خدا کے عذاب میں گرفتار ہوئی۔

جب یہ مطلب نہیں ہو سکتا تو پھر اس ذمہ داری کا مقصد کیا ہے؟ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہر مسلمان پر اپنی بیوی بچوں اور گھر کے دوسرے افراد کی اصلاح کے لیے سعی و جہد ضروری ہے۔ وہ اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اپنی وسعت کے اندر ان کی اچھی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرے۔ نیکی پر انہیں ابھارتا ہے اور بدی کے انجام سے ڈراتا ہے۔ ترغیب و ترہیب کی ہر ممکن صورت اختیار کرے اگر اس نے یہ کر لیا تو اس کی ذمہ داری پوری ہو گئی۔ عین ممکن ہے کہ اس تمام جدوجہد کے باوجود، بیوی اور بچے اصلاح پذیر نہ ہوں لیکن ان کو ہدایت یافتہ بنا دینا اس کے ذمہ نہ تھا اس لیے اس سلسلے میں اس سے باز پرس نہ ہو گی۔

تفسیر روح المعانی میں ایک روایت کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ جب یہ آیت اتری تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی ـــ یا رسول اللہ! ہم پر اہل و عیال کو "آگ" سے بچانے کی ذمہ داری ڈالنے کا مطلب کیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ تم انہیں ان چیزوں سے منع کرو جن سے اللہ نے تمہیں منع کیا ہے اور انہیں

ان چیزوں کا حکم دو جن کا تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے تو اس طرح یہ نہی عن المنکر اور امر بالمعروف انہیں آگ سے بچانے کا سبب بن جائے گا۔ اس روایت نے تمام ایسی ذمہ داریوں کا مطلب واضح کر دیا ہے جن کا تعلق دوسرے لوگوں سے ہوتا ہے۔ اس طرح کے احکام کی ایک اور مثال یہ ہے:۔

مثال ثانی

وَ اِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ	اور اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں
اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا۔	مقاتلہ کریں تو دونوں کے درمیان
(الحجرات: ۱۰)	صلح کرادو۔

یہاں بھی کہا گیا ہے۔ "صلح کرادو" اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ مصالحت پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ بالفعل دونوں گروہوں کے درمیان صلح کرا دینا کسی دوسرے انسان کے بس میں نہیں۔ اس کی قدرت میں جو کچھ ہے وہ کوشش ہے۔

مثال ثالث:

ٹھیک یہی حال سورہ شوریٰ کی آیت اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ کا حکم انبیاء کرام اور ان کے ماننے والوں کو ایسی قوم، ایسے ملک اور ایسے ماحول میں دیا گیا تھا جب کہ قوم کی غالب اکثریت خدا کی باغی اور دین حق سے منحرف تھی بلکہ پورا ملک اور اس کا ماحول خدا کا دشمن تھا۔ اس لیے کسی ایسی قوم میں اس کی ذمہ داری ڈالنے کا مطلب یہی ہے کہ اسے برپا کرنے کی جدوجہد کی جائے۔ شرک پر توحید کا غلبہ، باطل پر حق کا استیلاء اور مشرکین پر موحدین کی بالادستی اسی وقت ممکن ہے

جب موانع راہ دور کر دیے گئے ہوں اس کے بعد پورے دین کو بالفعل قائم کرنے کی ذمّہ داری ہوتی ہے۔

اگر ہم نے پورے خلوص کے ساتھ اقامت دین کی جدوجہد جاری رکھی اور اسی راہ میں مر گئے تو نہ صرف یہ کہ ہم اپنی ذمّہ داری پوری کریں گے بلکہ انشاءاللہ اس اجر کے بھی مستحق ہوں گے جو اللہ تعالیٰ نے جہاد فی سبیل اللہ اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے مہیّا کر رکھا ہے۔ اقامتِ دین کی مخلصانہ جدوجہد میں ناکامی کا سرے سے کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

عقل عام کی دو مثالیں

کسی حکم پر عمل کرنے کی سعی کے بعد ذمّہ داری سے عہدہ برآ ہو جانے کا معاملہ شرعی نصوص ہی سے نہیں بلکہ عقلِ عام سے بھی ثابت ہے اور کوئی عاقل اس سے اختلاف نہیں کرتا۔ فرض کیجیے۔ استاد نے کلاس میں اپنے شاگرد سے کہا، جاؤ مدرسے کے گھڑوں یا نل سے ایک گلاس پانی لاؤ۔ شاگرد اپنی جگہ سے اٹھا۔ اس نے ہر اس گھڑے کو دیکھا جس میں پانی ہو سکتا تھا لیکن کسی میں پانی موجود نہ تھا۔ پھر اس نے نل سے پانی لینا چاہا مگر وہ بھی خشک تھا۔ استاد کے پاس واپس آیا اور عرض کی۔ کسی گھڑے میں پانی موجود نہیں اور نل بھی خشک ہے۔ شاباش، کوئی حرج نہیں، بیٹھ جاؤ" یہ تھا استاد کا جواب ــــ کسی افسر اعلیٰ نے اپنے ماتحت افسر کو ایک مہم پر بھیجتے ہوئے حکم دیا۔ جاؤ، اس مہم کو سر کرو اور مجرم کو زندہ یا مردہ میرے سامنے حاضر کرو۔ چھوٹی سی پولیس فورس نے گھنے جنگل میں بڑی مشقت اٹھا کر ڈاکوؤں کی کمین گاہ کو گھیر لیا۔ ڈاکوؤں کے سردار نے گولیاں برسانی شروع کر دیں

ادھر سے بھی جواب میں گولیاں برسنے لگیں۔ اس مقابلہ میں ایک گولی، پولیس کے جواں سال افسر کا دل چیرتی ہوئی پشت سے باہر نکل گئی۔ ڈاکو فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور ماتحت افسر کی لاش، افسر اعلیٰ کے سامنے حاضر کی گئی، وہ لاش سے لپٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور پھر وہ لاش اعزاز واکرام کے ساتھ دفن کر دی گئی اور حکومت نے افسر کی بیوی بچوں کے لیے وظیفے مقرر کر دیے۔ یہ دو مثالیں، نادر مثالیں نہیں ہیں بلکہ اس طرح کی بیسیوں مثالیں روزانہ ہماری نگاہوں سے گزرتی رہتی ہیں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ شاگرد کو ایک گلاس پانی لانے کا حکم دیا گیا تھا مگر وہ پانی نہ لا سکا۔ ماتحت افسر پر مہم کو سر کرنے کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی لیکن وہ مہم سر نہ کر سکا، بلکہ خود اپنی جان گنوا بیٹھا۔ اس کے باوجود استاذ کی طرف سے شاباش اور حکومت کی طرف سے اعزاز واکرام کے کیا معنے؟ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دو میں کسی نے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی لیکن کیا فی الواقع بات یہی ہے؟ ذرا سا تامل واضح کر دیتا ہے کہ ان دونوں نے اپنی ذمہ داری پوری کر لی تھی اور وہ دونوں جس بات کے مکلّف گردانے گئے تھے، اس سے عہدہ برآ ہو چکے تھے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ شاگرد کو شاباش ملتی اور نہ افسر کو اعزاز واکرام نصیب ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر امر کے اندر یہ حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے کہ انسان کوشش کے بعد ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جاتا۔ پہلی مثال میں کون یہ کہہ سکتا ہے کہ شاگرد کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ گھڑ دل اور نل میں پانی موجود پائے اور موجود نہ ہو تو پانی پیدا کر کے گلاس بھر لائے۔ دوسری مثال میں کس

شخص کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ ماتحت افسر کی ذمہ داری یہ تھی کہ مجرم سے کسی حال میں شکست نہ کھائے اور اس کی گولی سے مرنے نہ پائے۔ عام حالات میں ہم جب کسی سے پانی مانگتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ پانی لاؤ۔ یہ نہیں کہتے کہ پانی لانے کی جدوجہد کرو۔ لیکن اس کے باوجود ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخاطب نے اگر پانی لانے کی کوشش کی اور کسی مانع کی وجہ سے نہ لاسکا تو وہ اپنی ذمہ داری پوری کرے گا اور کم سے کم ہماری ملامت یا سزا کا مستحق نہ ہوگا۔

فرار کا بہانہ

آخر صرف فریضۂ اقامت دین کو ایک ایسا فریضہ کیوں سمجھ لیا جائے کہ جب تک ہم بالفعل اسے انجام نہ دے لیں، ذمہ داری سے عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔ اگر کسی شخص کے لیے یہ انداز فکر اس فریضے کو انجام دینے کی جدوجہد سے فرار کا بہانہ بن بھی جائے تو کیا یہ بہانہ خدا کے یہاں بھی چل جائے گا؟

خلافت و ملوکیت

سید ابوالاعلیٰ مودودی

☆ اسلام میں خلافت کا حقیقی تصور

☆ وہ اصول جن پر وہ صدر اول میں قائم ہوئی

☆ ملوکیت میں تبدیل ہونے کے اسباب

☆ اس تبدیلی کے نتائج اور امت کا ردِّ عمل

☆ معقول اعتراضات کا جواب

اسلام کے سیاسی نظام اور دورِ اول کی تاریخ پر یہ ایک ایسی مستند دستاویز ہے جس سے محققین اور یونیورسٹی کے سیاسیات و اسلامی تاریخ کے طلبہ یکساں طور پر استفادہ کر سکتے ہیں۔

صفحات : ۳۲۸

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔ ۲۵

سُود اور منافع

ایک کواللہ نے حرام کیا ہے اور دوسرے کو حلال

سود

مصنف: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

- ☆ موجودہ معاشی نظام سراسر سُود پر مبنی ہے
- ☆ اسلام کا نظامِ معیشت سود سے مبرا ہے
- ☆ دونوں نظاموں کا تقابلی مطالعہ

معاشیات کے طلبہ کے لیے ایک بلند پایہ کتاب

عمدہ کتابت و طباعت — صفحات: ۳۲۳

معاشیات کے طلبہ، مسلمان تاجروں اور کاروبار کرنے والوں کے لیے ایک اہم کتاب

شرکت اور مضاربت

کے شرعی اصول

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی

جس میں معیشت کی اسلامی تنظیمِ نو، بالخصوص سود کے بغیر بینکنگ کا نظام قائم کرنے کے لیے شرکت و مضاربت کے شرعی اصول بیان کیے گئے ہیں۔ یہ اُردو میں اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ اس میں حنفی فقہ کے علاوہ دوسرے مکاتبِ فقہ کی مستند کتابوں کے حوالہ سے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر بحث کی گئی ہے۔ اور ایسے اصول متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو دورِ جدید کے حالات و ضروریات کے مطابق ہوں۔ جو لوگ سود سے مکمل اجتناب کرتے ہوئے نفع میں شرکت کے اصول پر سرمایہ جمع کر کے کاروبار کرنے سے دل چسپی رکھتے ہوں ان کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔

☆ عمدہ کتابت و طباعت — ☆ صفحات ۱۲۰

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔ ۲۵